چاند میرا ہے
غزالہ قمر اعجاز

نام : غزالہ قمر اعجاز

تعلیم : ایم۔ایس۔سی، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی (علیگ)

پتہ : B-132 ایم۔آئی۔جی۔فلیٹس، راجوری گارڈن،
نئی دہلی۔110027

ای میل : qamar_ghazala@yahoo.com

زیر طبع : 1) 1960 کے بعد خواتین افسانہ نگار

: 2) گھروندا (افسانوی مجموعہ)

اعزاز : کتھا ایوارڈ

کہانیوں کا ترجمہ : پنجابی، تلگو اور اڑیہ زبانوں میں
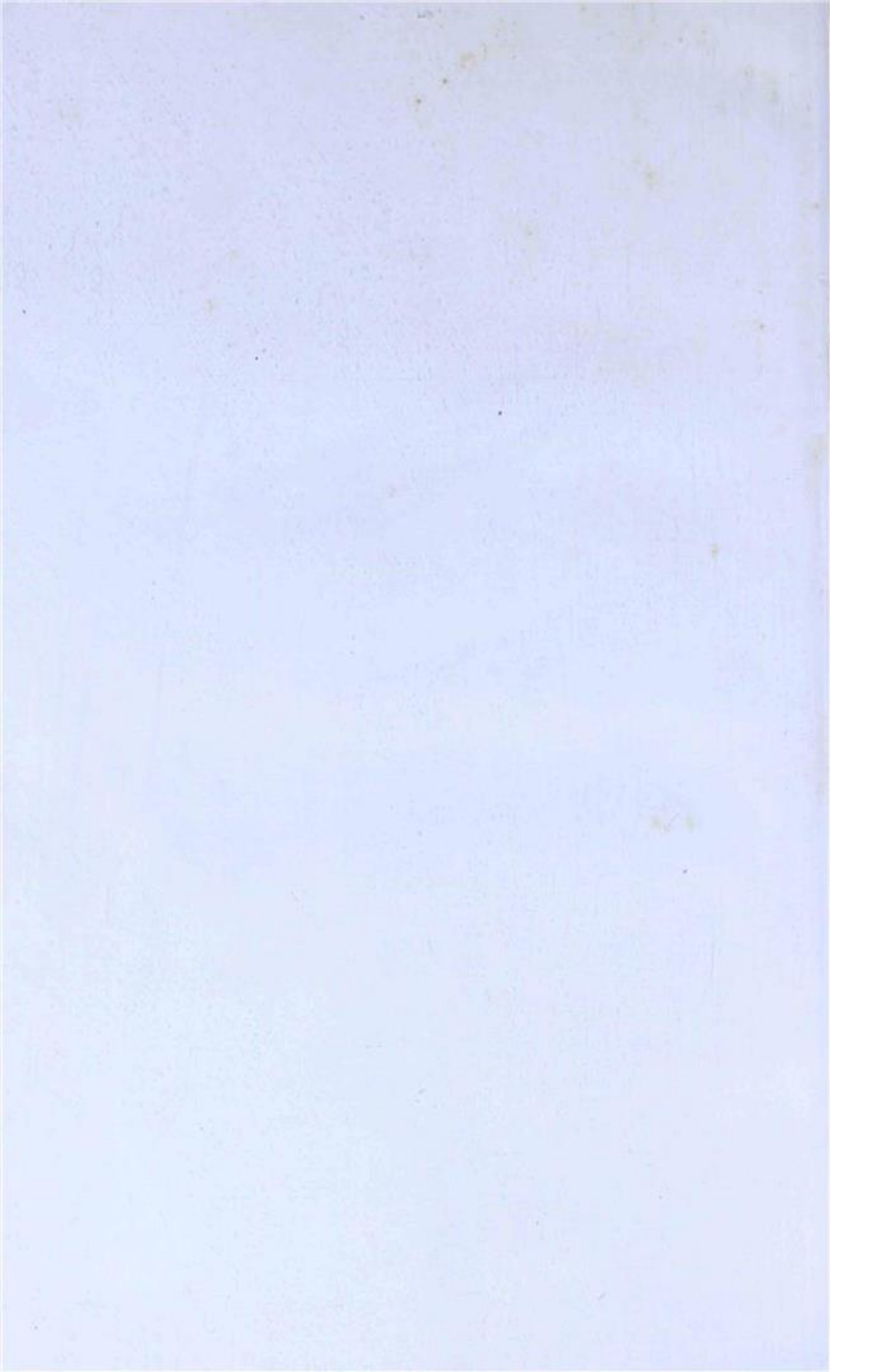
چاند میرا ہے

(افسانے)

چاند میرا ہے

(افسانے)

غزالہ قمر اعجاز

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

CHAND MERA HAI

(A Collection of Urdu Short Stories)

by

Ghazala Qamar Ejaz

Year of Edition 2011
ISBN 978-81-8223-813-8
Price Rs. 200/-

نام کتاب : چاند میرا ہے (افسانے)

مصنفہ : غزالہ قمر اعجاز

پتہ : ۱۳۲۔بی، ایم۔آئی۔جی۔فلیٹس، راجوری گارڈن، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۷

سنِ اشاعت : ۲۰۱۱ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے:

☆ 132-B، ایم۔آئی۔جی۔فلیٹس، راجوری گارڈن، نئی دہلی۔110027

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006

☆ اُردو بک ڈپو، انجمن ترقی اُردو، آندھرا پردیش، اُردو ہال، گلشنِ حبیب، حمایت نگر، حیدرآباد۔500029

☆ بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔800004

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔202002

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

ابّا

کے نام

جن کی نظر میں یہ مجموعہ

نایاب ہوتا!

○○

فہرست

اپنی بات

افسانہ ایک مکمل تجربہ ہے۔ جو کبھی ایک لمحے پر تو کبھی پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ کوئی بات دل کو چھو جائے یا دل کسی بات پر بے چین ہو جائے تو ذہن قلم اٹھانے کے لئے اکساتا ہے۔ کرۂ عرض پر بے شمار موضوعات ہیں جو حسرت و یاس سے صاحب قلم کو دیکھ رہے ہیں کہ کوئی تو ان کی طرف دیکھے.......... ان کو پرکھے.......... اور دنیا کے سامنے انہیں لائے۔ مگر آہ.......... انتظار باقی ہے۔

ادبی ذوق وراثت میں پایا۔ آنکھ کھولی تو اردو، ہندی، انگریزی، عربی اور فارسی کی کتابیں چاروں طرف دیکھیں۔ ''لفظ اور معنیٰ'' کی اہمیت ماں نے بتائی اور سمجھائی۔ ذہانت، سادگی اور قناعت باپ سے ملی۔ ''ابا'' لفظ زبان پر آتے ہی پلکیں تین سال پہلے کی طرح آج بھی نم ہو جاتی ہیں۔ بیٹیاں باپ کے قریب ہوتی ہیں انہیں زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہئے...... کاش ابا کو بھی کسی نے یہ سمجھایا ہوتا!

مجموعے میں موجود ہر کہانی قلم کے ذریعے ادا کی گئی دل کی آواز ہے۔ یہاں موضوعات اچھوتے نہیں ہیں.......... مگر Treatment جدا ہے۔ الفاظ دہرائے ہوئے ہیں.......... مگر نظریہ الگ ہے۔ جذبہ نیا ہے...... حوصلہ تازہ ہے...... امید ہی نہیں یقین

ہے کہ دل کی بات قلم کے راستے ہوتے ہوئے اور بھی بہت سے ذہنوں کو جھنجھوڑے گی۔

مجموعہ کو بہت پہلے منظر عام پر آ جانا چاہیے تھا...... مگر کچھ مجبوریاں تھیں جو راہ کی دیوار بن گئیں اور جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ میرے شوہر اعجاز کو میری اس خوبی کا علم ہوا اور افسانوں کو کتابی صورت میں دیکھنے کی ان کی پیار بھری خواہش کا اظہار جب اصرار میں بدلا تو مجھے کہنا ہی پڑا۔

''چل رے خامہ بسم اللہ''

نئی دہلی

غزالہ قمر اعجاز

مقبرہ

ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے۔ کیا کرنا چاہیے، آگے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کل رات سے پیروں میں ہلکا ہلکا درد تھا اور اس پر رات بھر پنکھا بھی چلتا رہا۔ سردی کے باوجود اٹھ کر بند کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب...... واپس گھر جاتے جاتے صرف سات بجیں گے۔ اس وقت بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد سمعیہ دوبارہ سو رہی ہوں گی اور ان کے فرماں بردار شوہر یعنی ہمارے برخوردار اپنی چائے بنانے کے بعد اب اخبار کے مطالعے میں مصروف ہوں گے...... اور میرے وقت سے پہلے پہنچنے پر وہ اخبار مجھے دے کر لان میں لگے پودوں کو پانی دینا شروع کر دیں گے۔ گھڑی اس وقت جیسے رک سی جاتی ہے۔ سمعیہ ساڑھے آٹھ بجے اٹھیں گی۔ ناشتہ میز پر رکھ کر مجھے اس انداز سے بلائیں گی جیسے کہہ رہی ہوں ''نٹھلو کھانے کے سوا تمہارا کام ہی کیا ہے''

''عثمان فاروقی صاحب...... آپ یہاں کس سوچ میں کھڑے ہیں۔'' فوراً پہچان لینے کے باوجود اپنی دنیا سے نکلنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ رسمی علیک سلیک ہوئی۔

''میں تو یہاں روز ٹہلتی ہوں مگر آپ کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔''

''اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ سے پہلے یہاں سے گزر جاتا ہوں۔

چلئے کھڑے ہو کر سوچنے کا یہ فائدہ ہوا۔''

''اپنے کسی پرانے کلیگ سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے چلئے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' مجھے عجیب سا لگا۔'' کہاں'' حالانکہ اب ہم دونوں ہی عمر کے اس حصے سے بہت دور تھے جہاں بیٹھ کر باتیں کرنے کو معیوب سمجھا جائے یا پھر اس بات کی بذات خود کوئی اہمیت ہو...... مگر میری گھبراہٹ کی وجہ دوسری تھی کہیں مس سہیلہ نے میرے گھر چلنے کی خواہش ظاہر کی تو......؟ رفیعہ ہوتی تو وہ گرم گرم ناشتے سے مس سہیلہ کی خاطر مدارت کرتی...... مگر میرا گھر جہاں اس وقت آرام کرتی بہو اور پودوں کو پانی دیتا بیٹا...... میں پھر سوچ میں ڈوبنے ہی والا تھا کہ مس سہیلہ کی آواز آئی۔

''چلئے یہاں سے قریب ہی ہے میرا گھر...... نشاط اپارٹمنٹس۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔''

''آپ تو پہلے پرانے قلعے کی طرف......''

''رہتی تھی مگر وہ جگہ بہت دور تھی۔ پھر بارش کے دنوں میں بہت پریشانی ہوتی تھی...... اس کے بعد میں مزمل اپارٹمنٹس چلی گئی مگر وہ یونیورسٹی سے دور تھا...... سیڑھیاں تو چڑھ لیں گے نا۔ بھئی اس عمر میں کتنا بھی فٹ رہ لیں سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہی ہوتا ہے...... کوئی اچھا گراؤنڈ فلور پر فلیٹ مل جائے تو میں لے لوں گی۔'' تفصیل سے ان کی بات کرنے کی عادت سے کبھی پریشان تھے مگر اس وقت مجھے اچھا لگا۔

''ٹہلنے کے بعد میں عموماً باتھ لے کر ہی چائے پیتی ہوں، آپ اخبار پڑھئے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

اخبار...... دن کا میرا زیادہ تر وقت اخبار یا پھر کتابیں پڑھتے ہی گزرتا ہے۔ ناشتے کے بعد دو گھنٹے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گزارنے کے بعد سمعیہ گھر سے نکل جاتی ہیں۔ کبھی سامان لینے...... کبھی کسی بیمار دوست کو دیکھنے تو کبھی اور کسی ضروری کام سے...... جھاڑو اور برتن دھونے والی کی نگرانی میرے ذمے ہے۔ ایک بجے کے آس پاس وہ لوٹتی ہے بچوں اور میاں کے واپس آنے پر پسینے میں شرابور کھانا لگاتے ہوئے وہ اپنی ذمہ داریوں کی لمبی

فہرست سنانا شروع کر دیتی ہے۔ میں خاموش سامع کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کی مصروفیت اور تھکان کی داستان سنتا رہتا ہوں۔

ایسے میں مجھے اکثر رفیعہ یاد آجاتی...... گھر کا کام اتنا مشکل ہوتا ہے یہ احساس اس نے مجھے کبھی ہونے ہی نہیں دیا۔ یونیورسٹی میں جب میرا تقرر ہوا تھا اس وقت وہ دونوں بچوں کے ساتھ گاؤں میں تھی۔ بچے اسکول جانے کے لائق ہوئے تو ابا کے زور دینے پر میں نے کرائے کا گھر لیا اور اسے یہاں لے آیا۔ دو کمرے کا چھوٹا سا مکان بہت سی بنیادی ضرورتوں سے بھی لیس نہ تھا مگر وہ یہاں آکر بہت خوش تھی۔ بچوں کے داخلے ہوئے...... صبح ان کو اسکول بھیج کر اور میرے یونیورسٹی جانے کے بعد وہ کیا کرتی ہے مجھے کچھ علم نہ تھا۔ میرے لوٹنے پر چمچماتا گھر اور صاف ستھری رفیعہ مجھے منتظر ملتی۔

میں جب تک کپڑے بدلتا وہ دسترخوان سجا دیتی۔ تازہ تازہ گرم کھانا...... بچوں کی دلچسپ باتوں کے بیچ ختم ہوتا۔ میں دوپہر کو سونے کا عادی تھا اس سے بھی کہتا وہ بچوں کو لے کر لیٹ بھی جاتی مگر جب اٹھتا تو اسے اکثر سلائی مشین پر یا پھر کوئی اور کام کرتے دیکھتا۔ بغیر کسی پیچیدگی کے وقت گزرتا رہا۔ میرا پروموشن ہوا...... رفیعہ کی بھی مصروفیت بڑھی۔ پھر ہم نے مکان کی تعمیر شروع کی اور جس دن ہم ادھورے مکان میں شفٹ ہوئے وہ دن ہماری زندگی کا ایک خوش گوار دن تھا۔ قرآن خوانی ہوئی...... لڈو تقسیم کیے گئے...... گھر کے ایک ایک کونے میں ہماری ہنسی خوشی بسی تھی مگر پھر پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی اور رفیعہ ایسی بیمار پڑی کہ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی اور زندگی ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی۔ گھریلو معاملات کا مجھے کوئی علم ہی نہیں تھا۔ بیٹی بی ایس سی کر رہی تھی اور اشہر انجینئرنگ...... بہت وقت لگا تال میل بٹھانے میں...... مگر وقت گزرتا رہا...... اشہر کو لکچرر شپ مل گئی اور صبا شادی کر کے امریکہ چلی گئی۔ میں ریٹائر ہو گیا۔ سمعیہ بہو بن کر گھر آگئی۔ اس کے آتے ہی دھیرے دھیرے سب تبدیل ہوتا رہا۔ ہماری محبت اور محنت سے بنائی گرہستی اسے دقیانوسی لگتی۔ کبھی کچن پرانے طرز کا محسوس ہوتا تو کبھی باتھ روم میں شاور کی کمی اسے کھلتی تو کبھی رفیعہ کے ہاتھ کے سلے پردے out dated لگتے۔ دھیرے دھیرے تبدیلیاں ہوتی

رہیں اور اس تبدیلی میں میرا وجود کہیں گم ہوتا گیا اور میں اپنے ہی گھر میں محض ایک تماشائی بن کر رہ گیا۔

''چائے'' مس سہیلہ کی آواز آئی۔ فریش ہو کر گیلے بالوں کو برش کیے دھیمی دھیمی خوشبو میں بسی وہ چائے بنا رہی تھیں۔

''شکر لیتے ہیں یا نہیں۔'' چیچ اٹھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''ڈائبیٹیز تو نہیں ہے مگر احتیاطاً آدھا چیچ لیتا ہوں۔''

''ابھی سیمنار میں سب لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر آپ......''

پھر باتوں کا سلسلہ چلا تو چلتا ہی گیا...... ناشتہ اور پھر چائے۔ گھڑی دیکھی تو بارہ بجنے والے تھے۔ پتہ نہیں آج سمعیہ کا کیا پروگرام تھا۔ میں نے مس سہیلہ سے اجازت لی۔ واک پر اگلے روز ملنے کا پروگرام طے ہوا اور میں واپس آ گیا۔

دروازہ کھلا تھا...... سمعیہ ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ ''ایک دوست سے ملاقات ہو گئی باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔'' میں نے دیر سے آنے کا جواز پیش کیا۔ پتہ نہیں اس نے سنا یا نہیں۔

''ناشتہ لاؤں۔''

''نہیں نہانے کے بعد صرف چائے پیوں گا۔''

نہا کر نکلا تو نوکرانی چائے کا کپ رکھ کر جا چکی تھی۔ سمعیہ نے اپنا تمام غصہ شاید چائے پر نکالا تھا۔ عجیب بدمزہ چائے تھی۔ میں نے پیالی واپس رکھ دی۔ مس سہیلہ کی چائے مجھے یاد آئی۔

میری نوکری کو پانچ سال ہو چکے تھے جب مس سہیلہ کا تقرر ہوا تھا۔ ان کی تقرری کا احساس صرف ہمارے ہی شعبہ کو نہیں بلکہ آس پاس کے شعبہ کو بھی ہوا تھا۔ ترشے ہوئے چمکیلے بال...... سلیقے سے پہنی گئی خوبصورت ساڑی اور ہائی ہیل کی چپل میں کھٹ کھٹ کرتی جس وقت وہ داخل ہوتیں ان کے جسم سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف اپنی موجودگی کا احساس کرا جاتی۔ کھنکتی آواز اور خوش مزاجی ان کا اثاثہ تھی۔ لہجے اور مزاج کی بیبا کی ان کو

اور پراسرار بنا جاتی۔اپنے اپنے چیمبر میں بیٹھے لوگوں کی نظریں دروازے پر ٹک جاتیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مس سہیلہ گزر جائیں اور ان کی آنکھیں اس حسین منظر کو قید کرنے سے محروم رہ جائیں۔ان کے بارے میں روز نت نئے انکشافات ہوتے اور تھوڑی دیر کی گفتگو میں بھی مس سہیلہ کا ذکر آنا ضروری ہو گیا۔وہ کس کس سے ملیں کہاں گئیں......کون کون ان کے چیمبر میں گیا اور کتنی دیر رکا...... یہ حساب کتاب سب کو ازبر رہنے لگا۔گھر پہنچ کر کھانے کے دوران میں رفیعہ سے اکثر مس سہیلہ کا ذکر کرتا......ایک دن راستے میں وہ نظر بھی آ گئیں۔ گھر آ کر رفیعہ نے ان کا خاصا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔شرم وحیا سے عاری ان کا چہرہ...... گہرے کٹے گلے اور بغیر آستین کا ان کا بلاؤز...... بار بار سرکتا ان کا آنچل اور اس کو سنبھالنے کی ان کی ناکام کوشش...... کچھ بھی تو اس کو پسند نہیں آیا تھا۔

''ایسی عورتیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔'' اس جملے پر اس نے اپنی بات ختم کی تھی۔پھر ایک عید پر مس سہیلہ ہمارے گھر آ گئیں...... بیباک اور پہلی نظر میں مرعوب کر دینے والی مس سہیلہ سیدھی سادی گھریلو قسم کی رفیعہ سے بہت گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔اس کی بنائی سوئیوں اور بریانی کی خوب تعریف کی اور پھر ہر عید پر آنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

مس سہیلہ سے واک پر روز ملاقات ہوتی اکثر میں ان کے گھر جانے لگا...... وہ خاصی ملنسار اور پرخلوص تھیں......ان کی شخصیت کا یہ نیا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔نفاست سے سجا گھر ان کی گھریلو دلچسپی کا مظہر تھا۔وہ بے حد صاف گو تھیں، لگی لپٹی باتوں سے دور ......اور ان کی اس صاف گوئی اور بیباکی نے شاید لوگوں کی نظر میں ان کو مغرور بنا ڈالا تھا۔

''میرے کلیگس ہمیشہ مجھ سے دور رہے......شاید میری صاف گوئی اور بیباک گفتگو سے خائف رہے...... میرے بارے میں سب جاننا چاہتے تھے مگر مجھ سے ہمیشہ ایک فاصلے پر رہے۔'' ایک عام سے انداز میں شکوہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنا تجزیہ پیش کیا میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''یہی تو خرابی ہوتی ہے آپ لوگوں میں جہاں تائید کرنی ہوتی ہے وہاں صرف

مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ Corrupt یہ Intellectual Class ہوتا ہے۔''

''آپ بھی اسی کیٹگری میں آتی ہیں۔''

''شکریہ...... آپ نے اس بہانے ہی سہی مجھے Intellectual تو سمجھا۔'' اور ایک بھرپور قہقہہ گونجا...... پھر ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ عجیب تھی یہ خاموشی...... مس سہیلہ جیسی بیباک خاتون بھی Uneasy feel کر رہی تھیں۔

''مجھے چلنا چاہیے ورنہ سمعیہ ناراض ہو گی۔''

''سمعیہ''

''میری بہو......''

''زمانہ واقعی بدل ہو چکا ہے۔ بہت ڈرتے ہیں۔''

''بیوی تو ہے نہیں جس پر اپنی مصروفیت کا رعب ڈال دوں گا۔ نہ ماں ہے جو دیر ہونے پر محبت جتائے گی۔ بہو ہے ناراض ہو گئی تو کھانا ملنا مشکل ہو جائے گا۔''

''چلیئے ناشتے کے ساتھ کھانا بھی یہیں کھا لیجئے گا۔'' مس سہیلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ بچوں کی چھٹی تھی اشہر گھر پر تھا۔

''دو بج رہے ہیں کھانا کھا لیجئے۔'' میز پر گلاس رکھتے ہوئے سمعیہ نے زور سے کہا تھا۔ شاید مجھے وقت کا احساس دلا رہی تھی۔ بیٹا بھی کچھ خفا خفا سا نظر آیا۔ ''کہیں پتا تو نہیں چل گیا کہ میں کہاں تھا۔'' نوالہ منہ میں ڈالتے ہی مجھے خیال آیا تو کیا؟ میں نے خود کو دلاسہ دیا اور آرام سے کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

''کھانا بھی یہیں کھا لیجئے گا؟'' مس سہیلہ کا جملہ یاد آیا۔ وہ بھی بالکل تنہا ہیں۔ پتہ نہیں شام کو کیا کرتی ہوں گی۔ اس وقت تو خیر سو رہی ہوں گی۔ سمعیہ چائے لے کر آئی تو میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا چھ بجے تھے۔ شاید وہ بھی چائے پی رہی ہوں گی...... فون برآمدے میں رکھا تھا۔ سمعیہ وہیں بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ اس وقت میں لان میں پودوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں...... مگر آج...... سمعیہ نے ایک دو بار میری طرف دیکھا...... پوچھا کچھ بھی نہیں۔

پھر میں نے ہچکچاتے ہوئے نمبر ڈائل کیا۔فون مس سہیلہ نے اٹھایا......ایک دو بار ہیلو ہیلو کہا پھر رکھ دیا......وہ گھر پر ہی ہیں۔......سمعیہ اب بھی وہیں تھی اور بچوں کا ہوم ورک چیک کر رہی تھی۔یہ کام اندر بھی ہوسکتا ہے......مگر نہیں میری ضد ہے۔

میں باہر لان میں آیا۔مسز خان گزر رہی تھیں۔مجھے دیکھ کر رک گئیں۔میں زبردستی انہیں اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا اور سمعیہ کو ان کے آنے کی اطلاع دی۔

''ہیلو مس سہیلہ کیسی ہیں آپ''اس کے جاتے ہی میں نے فون ملایا اور سمعیہ کے واپس آنے تک ان سے بات کرتا رہا۔

آج وہ واک پر نہیں آئی تھیں۔مین روڈ سے ہوتا ہوا میں ان کے گھر آ گیا۔

''رات سے ہی طبیعت خراب تھی آپ کے گھنٹی بجانے پر اٹھی ہوں۔''

''مجھے فون کر دیا ہوتا میں آ جاتا۔''

''اب کہاں رات میں آپ کو پریشان کرتی دوا تھی میرے پاس۔''

میں نے چائے بنائی اور بریڈ پر جیم لگا کر سہیلہ کو دیا۔

''یہ فلیٹ بالکل روڈ پر ہے۔آج کل الیکشن کی وجہ سے دیر رات تک ہنگامہ رہتا ہے۔سیڑھی چڑھنا بھی مشکل ہے۔سوچتی ہوں کوئی دوسرا فلیٹ لے لوں۔''

''دوسرا فلیٹ......''

''ہاں کلاسک اپارٹمنٹ اچھا ہے۔چلئے کل آپ بھی دیکھ لیجئے تو فائنل کر لیتے ہیں۔''

فلیٹ اچھا تھا۔مجھے پسند آیا۔سہیلہ کو تو پہلے سے ہی پسند تھا۔بلڈر بھی وہی تھا اس لیے تبدیل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور سودا ہو گیا۔

''فلیٹ میں یہی آرام ہوتا ہے جب چاہا بدل لیا کوئی Attachment نہیں ہوتا۔''

سچ کہا تھا سہیلہ نے......زندگی کو اپنی ضرورت اور سہولت کے مطابق گزارنا چاہیے تاکہ وابستگی یا پھر Attachment کو بنیاد بنا کر......میرا گھر......کون سی دیوار ساڑھے تین انچ کی ہے اور کون سی چھ انچ کی مجھے یاد ہے۔مستری، مزدور یا پھر الیکٹریشن اور پلمبر نے مجھے کیسے کیسے ستایا وہ بھی یاد ہے......اور یادیں......یادیں تو پھر عذاب ہی ہوتی

ہیں چاہے مکان کی ہوں یا پھر بیوی کی۔

''میں یادوں کا روگ نہیں پالتی...... خوشی اور غم دونوں ہی ملے...... اور میرے خیال میں یہ دونوں ہی کیفیات زندگی کی رفتار کو دھیمی کر دیتی ہیں۔''

''غلطیاں زندگی میں سب سے ہوتی ہیں...... پچھتانے کے بجائے ان سے سبق لینا چاہیے۔''

''میں ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔'' مس سہیلہ نے کہا تھا اور ہم بھی آگے بڑھتے رہے۔ زندگی میں رونق اور دلچسپی لوٹ آئی تھی۔

اس دن اچانک بارش ہونے لگی۔

''علی گڑھ میں جس حساب سے سردی اور گرمی پڑتی ہے اگر اسی حساب سے بارش بھی ہونے لگے تو اسکول اور یونیورسٹی میں برسات کی چھٹیاں بھی کرنی پڑیں گی۔''

سڑک پر پانی بھرتا دیکھ کر سہیلہ نے کہا تھا۔ پھر بہت دیر تک ہم بالکونی میں کھڑے بارش کا نظارہ کرتے رہے۔

''یہ تو چائے اور پکوڑوں کا موسم ہو گیا۔''

''کھائیں گے...... حالانکہ میں نے اکیلے کبھی نہیں بنایا ہے۔''

''چلئے میں سکھاتا ہوں۔ میں بہترین گائڈ رہا ہوں۔ تیرہ پی ایچ ڈی اور اٹھارہ ایم فل میں نے نکالے ہیں۔''

''پروفیسر شپ کے لیے میرے خلاف یہی ہتھیار لے کر گئے تھے آپ۔ حالانکہ بازی میں نے مار لی تھی۔''

''اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ آپ نے...... ہر طرف یہ بھی تو مشہور ہوا تھا۔''

''آپ جیسے مخلص کلیگس کی بدولت۔''

''یہ زیادتی ہے سہیلہ''

''زیادتی نہیں میری وہی بیبا کی کہئے عورت ہوں مگر حسد اور کپٹ سے خالی......

صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے سے میں کبھی نہیں جھجکتی ،اس لیے ہمیشہ ہر ازم سے دور رہی اور سارے ہی گروہ کو تجسس میں رکھا۔''

''اور اس لیے ہمیشہ اپنی ذات میں انجمن رہیں۔''

''ریٹائرمنٹ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آپ جیسے مخالفین ہماری موافقت ہی نہیں تعریف بھی کرنے لگے۔''

''آپ نے پکوڑوں کی بات کی تھی گائڈ کرنے کے لیے میں اب بھی تیار ہوں۔''

''بیسن میں نمک اور لال مرچ کے ساتھ تھوڑا سا سوڈا ڈالنے سے پکوڑے ملائم ہو جاتے ہیں۔تم پیاز کاٹو میں گھول بناتا ہوں۔''

سب سامان میں نے اپنے سامنے رکھا، سہیلہ نے پیاز اور چاقو لیا۔

''وہ کچن میں کام کرنے کی عادت بالکل چھوٹ گئی ہے نا اس لیے'' انگلی سنک میں دھوتے ہوئے سہیلہ نے کہا۔

''ارے یہ تو گہری کٹ گئی، پٹی کرنی پڑے گی۔'' میں نے انگلی کو بے ساختہ پکڑتے ہوئے کہا۔ہم دونوں کی نظریں ملیں..... چند لمحے گزر گئے...... یہ کیا ہو گیا...... شاید دونوں نے ہی سوچا..... سہیلہ کی انگلی سے بہتا خون میرے ہاتھ میں لگا تو میں چونکا۔

''تم اس اسٹول پر بیٹھو...... میں پٹی باندھتا ہوں۔'' جس بے ساختگی سے میں نے انگلی کو تھاما تھا اسی جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے کہا...... ''کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔'' یہ خدشہ شاید ہم دونوں کو ہی تھا۔

خون صاف کر کے میں نے پٹی باندھی...... فرسٹ ایڈ باکس کو اپنی جگہ پر واپس رکھا...... عجیب سی کیفیت سے ہم دوچار تھے...... جیسے باتوں کا خزانہ یکا یک ختم ہو گیا ہو...... مگر ہماری خاموشی کی زبان نے اپنے اپنے دلی جذبات کو عیاں کر دیا تھا۔جو بھی تھا ساری Situation کافی دلچسپ اور معنی خیز تھی۔

''پکوڑے'' سہیلہ کافی کوشش کے بعد بولیں تو ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

''چلو میں بناتا ہوں'' بیسن کے گھول کو کڑھائی میں ڈالنے اور نکالنے کا وہ پندرہ

بیس منٹ کا تجربہ ہمارے ۳۵ سالہ کیریئر سے بھی زیادہ ہیجان انگیز ثابت ہوا۔ پہلی بار بہت اوپر سے گھول ڈالنے پر تیل کی چھینٹیں سہیلہ کے اوپر پڑیں۔ اس کو ہٹانے کے لیے میں نے بیسن میں ڈوبا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ پکوڑے کالے پڑنے لگے تو انہیں پلٹنے کے لیے جلدی میں گیلا چمچ کڑھائی میں ڈالا تو تڑتڑاتا تیل کی چھینٹیں اڑنے لگیں...... پکوڑا تو جل کر کوئلہ ہو ہی گیا ہم دونوں کی صورت بھی کسی کے لیے پہچاننی یقیناً مشکل تھی۔ بال، چہرہ، ہاتھ اور کپڑے غرض ہر جگہ بیسن ہی بیسن تھا۔ آخر کے تین چار پکوڑے کھانے کے قابل تھے بلکہ انہیں کھا کر سہیلہ نے ان کو ایک بہترین Cook کا سرٹیفکٹ بھی دے دیا۔ پھر چائے بنی...... اور چار پانچ گھنٹے کیسے گزر گئے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

گھر پر دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگ سو رہے تھے کئی بار گھنٹی بجانے کے بعد سمعیہ نے دروازہ کھولا اور واپس کمرے میں چلی گئی۔ میز پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ مگر بھوک تو چائے اور پکوڑوں نے دور کر دی تھی۔

سمعیہ تک یہ بات شاید پہنچ گئی تھی کہ واک کے بعد کا وقت میں مس سہیلہ کے ساتھ گزارتا ہوں۔ اس رات کھانے کی میز پر بغیر کسی کو مخاطب کیے اس نے کہا تھا۔

''تابش کے دوست فراز کا گھر اسی بلڈنگ میں ہے جہاں مس سہیلہ رہتی ہیں۔''

کھانا میرے گلے میں اٹک گیا اور میں کھانسنے لگا۔ بات ٹل گئی...... مگر ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اور آگے بڑھ گئی۔

اس دن سہیلہ نے کہا۔

''لوگ ہمارے بارے میں باتیں بناتے ہیں۔''

''اس عمر میں۔''

''لوگوں کو بس موقع چاہیے۔''

''پھر......؟''

اس ''پھر'' کا حل ڈھونڈنے میں کئی دن لگ گئے۔ حیدرآباد کی ایک کانفرنس میں ہم دونوں کو ہی بلایا گیا تھا۔

''حیدر آباد چلتے ہیں۔ وہاں رہیں گے۔ ہمارے پیچھے کون کیا کہتا ہے اس کی کیا پرواہ؟...... پھر لوگ تو ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کہتے رہے ہیں میں تو عادی ہوں مگر آپ......''

''تم مجھے عادی بنا دینا'' اور سارا پروگرام فائنل ہو گیا۔

رات کے کھانے پر میں نے حیدر آباد جانے کی بات کہی اور یہ بھی کہا کہ مس سہیلہ بھی ساتھ رہیں گی۔ دونوں ہی چونکے۔

''لوگ کیا کہیں گے...... وہ فراز کی ممی کہہ رہی تھیں......''

''تم لوگوں کو کچھ کہنا ہے'' سمعیہ کو روکتے ہوئے میں نے کہا۔ دونوں خاموش تھے میں کمرے میں آ گیا۔ چھ بجے کی گاڑی تھی۔ سہیلہ کا ڈرائیور مجھے پانچ بجے لینے آئے گا۔ میں نے اشہر کو بتایا جو کمرے میں میری ضرورت پوچھنے آیا تھا۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ کئی بار میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں ٹہلتا رہا...... کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ نوجوانی میں گھر چھوڑنے کا عمل دلچسپ ہوتا ہوگا مگر اب جب بالوں میں تجربہ سفیدی بن کر جھانک رہا ہو اپنے سے وابستہ چیزوں سے کنارا کش ہونا کتنا غیر فطری اور تکلیف دہ ہے اس کا اندازہ مجھے ہو رہا تھا...... میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی...... تین انچ اور چھ انچ کی دیوار...... میری یادداشت مجھے دھوکہ دے رہی تھی...... میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا...... یادیں تو عذاب ہوتی ہیں...... ہاں سچ...... مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا...... یہاں زندگی نہیں صرف یادوں کا مقبرہ ہے اور مقبرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے......

میں کمرے میں آیا۔ گھڑی ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ میں تیار ہوا اور ڈرائیور کے پہلے ہارن پر ہی میں نے دروازہ کھول دیا۔ گاڑی نے موڑ کاٹا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اشہر اور سمعیہ اب بھی گیٹ پر کھڑے تھے۔ میں نے آنکھوں میں آئے گیلے پانی کو بیدردی سے رگڑا۔ میں زندگی کی طرف دوبارہ جا رہا تھا۔

☆☆

ایک اور سریتا

میرے لڑکھڑاتے جسم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر نریش نے مجھے بیڈ روم تک پہنچایا ہوگا اور پھر بستر پر لٹا کر اپنے ہاتھوں کو جوتے نکالنے کے لیے جیسے ہی بڑھایا ہوگا سریتا نے اسے روک دیا ہوگا اور میرے جوتے نکالنے لگی ہوگی۔ نریش تھوڑی دیر وہاں نادم سا کھڑا رہا ہوگا جیسے ان حالات کا ذمہ دار وہ خود ہو، پھر اسی خاموشی کے ساتھ وہ جانے کے لیے مڑا ہوگا۔ سریتا اس کو پہنچانے کے ارادے سے کھڑی ہوئی ہوگی مگر پھر یہ سوچ کر رُک گئی ہوگی کہ نیہا لاؤنج میں پڑھ رہی ہے۔ نریش کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کرلے گی، چند لمحے کے لیے ہمارے کمرے کی طرف دیکھے گی اور دوبارہ کتاب لے کر بیٹھ جائے گی۔ نشے کے باوجود روز کا یہ معمول مجھے ازبر ہے...... کہتے ہیں نشہ آدمی کو جسمانی اور ذہنی دونوں ہی سطح پر مفلوج کردیتا ہے...... مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ گھر پہنچنے سے پہلے میرے ساتھ کیا پیش آتا ہے مجھے کچھ یاد نہیں رہتا مگر گھر پہنچتے ہی میرے دماغ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور گھر کا ہر منظر میرے اندر ثبت ہوجاتا ہے۔

میز پر ناشتہ رکھتی سریتا کالج جانے کے لیے تیار ہے۔ میں مجرم سا کھڑا اخبار اٹھالیتا ہوں۔ گھڑی دیکھتے ہوئے سریتا زور سے کرسی کھسکاتی ہے۔ میں اخبار رکھ کر بیٹھ

جاتا ہوں۔ وہ چائے بنارہی ہے۔

''بچے چلے گئے۔'' میں بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھتا ہوں۔ یہ بھی ایک طرح کا معمول ہے۔

''ہوں۔'' وہ بریڈ میری طرف بڑھاتی ہے اور خود جلدی جلدی چائے ختم کرتی ہے۔کلف لگی کاٹن ساری...... بڑی سی بندی...... سیندور اور ہلکی سی لپ اسٹک...... آج مجھے اتنے غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ جھینپ سی جاتی ہے۔ وہی جھینپ جو پہلی بار میں نے محسوس کی تھی۔

دانشوروں کے فورم کی طرف سے میں ایک مباحثے میں اپنے اخبار کی طرف سے اس کے کالج گیا تھا۔ عام طور پر ایسے جلسوں میں طلباء کی تعداد نا کے برابر ہوتی ہے۔ میرے لکچر کو بے حد غور سے سنتی وہ لڑکی میری نظروں کے حصار میں رہی اور پروگرام کے بعد میرا آٹوگراف لینے آگئی۔ مجھے تعجب ہوا۔

''میں کوئی سلیبریٹی نہیں ہوں، جو آٹوگراف دینا میرا مقدر بنے۔''

''اپنی بات کو وضاحت اور دلیلوں سے دوسروں تک پہنچانا بھی ایک فن ہے۔ بہت اچھی تھی آپ کی تقریر۔ اگر آپ کی ایک بات پر بھی ہم سنجیدگی سے غور کریں تو سماج میں بدلاؤ یقینی ہے۔''

''آپ کریں گی۔''

''کوشش ضرور کروں گی۔''

ایک لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر خوش ہونا فطری تھا ایک نئے جوش اور ولولے سے میں نے اپنے قلم کی طرف دیکھا۔

میرے اخبار کے توسط سے وہ ایک دن میرے گھر آگئی۔ دروازہ عموماً کھلا رہتا ہے اور لوگ بے دھڑک گھس آتے ہیں۔ گھنٹی لگوانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اس وقت کسی نے بے حد سلیقے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرا گھر...... صرف ایک کمرہ...... ایک بیڈ...... ایک میز اور دو کرسیاں...... کھونٹی پر ٹنگے کپڑے...... باہر چھوٹے سے برآمدے

میں میز پر چائے بنانے کا سامان اور کچھ برتن...... اور اسی کمرے میں اس وقت وہاں ایک خوبصورت سی نفاست سے تیار ذہین سی لڑکی کھڑی تھی...... پہلی بار مجھے شرمندگی ہوئی...... اپنے کمرے سے...... بے ترتیبی سے...... اپنے حلیے سے اور اپنے آپ سے بھی...... میں نے صفائی دی...... مادی زندگی کے خلاف لمبا لکچر بھی دیا...... امیری اور غریبی کی بڑھتی خلیج پر بحث بھی کی اور کچھ حقیقت اور کچھ دلائل سے اسے قائل کرنے کی کوشش بھی کی۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا...... سریتا نے چائے بنائی اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ کمرے میں عجیب سی خوشبو پھیل گئی۔ ''عورت'' کو پہلی بار میں نے اس کمرے میں محسوس کیا تھا۔ سریتا جا چکی تھی...... مگر وہ تھی ہر جگہ...... اس کی مسکراہٹ...... اس کی ہنسی...... اس کے قہقہے...... کبھی میری باتوں پر سر ہلاتی...... کبھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی......

اور پھر...... پھر...... اس کی ڈانٹ...... میرے سگریٹ پینے پر پہلے اس نے ناپسندیدگی دکھائی...... پھر ناراض ہوئی...... تیسری بار میں نے جلانے کی کوشش کی تو اس نے ڈانٹ دیا اور پیکٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ایک ہی ملاقات میں بات جان پہچان سے ہوتی ہوئی حق تک پہنچ گئی۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔ رومان کی چاشنی میں نے پہلی بار اپنے اردگرد محسوس کی اور سب کچھ بے حد رنگین اور خوشگوار لگا۔ وہ آئے گی یا نہیں...... ساری رات سوتے جاگتے گزر گئی۔ تین دن عجیب کشمکش میں گزرے اور امید ناامیدی میں تبدیل ہونے ہی والی تھی کہ وہ آ گئی...... اور پھر آتی ہی رہی۔ سریتا ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ عیش و عشرت میں پلی بڑھی۔ ہمارے بیچ ایک خلیج ضرور تھی، مگر اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور سریتا کی ضد اور خواہش کے آگے سب ہار گئے۔ حساب کتاب جوڑ کر میں نے ایک فلیٹ لے لیا۔

''میرا گھر بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس میں سریتا ہے۔'' وہ خوش ہو گئی اور پھر میرے جملوں کی بازی گری پر اس نے خوش ہونا سیکھ لیا حالانکہ تخیل اور حقیقت سے تال میل بٹھانے میں اسے شاید بہت کچھ قربان کرنا پڑا تھا۔ اپنی پڑھائی اس نے جاری رکھی اور پھر اسی کالج میں لکچرر ہو گئی۔ اس کی تنخواہ کی بدولت گھر کا ایک روٹین بن گیا۔ نیہا اور آدتیہ نے اس کی ذمہ داریوں کو شاید بہت بڑھا دیا تھا اور وہ اکثر خاموش رہنے لگی۔ اب بھی وہ خاموش

تھی۔ ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر آئی اور وہ ''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' کہہ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ معمول کے برخلاف میں بھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اسے شاید توقع نہیں تھی۔ اس لیے وہ بغیر مڑے آگے بڑھ جاتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں ہم دونوں کی شادی کی تصویر رکھی ہے۔ میں اسے غور سے دیکھتا ہوں اور اس سریتا کا آج کی سریتا سے موازنہ کرنے لگتا ہوں...... شوخ چنچل اور حاضر جواب سریتا صرف ایک استانی اور گرہستن بن کر رہ گئی ہے...... کیا اس کی تبدیلی اچانک تھی یا بے حد دھیمی...... جو میں اب محسوس کر سکا ہوں...... اتنے دنوں...... مہینوں اور سالوں کے بعد۔

اس دن نیہا نے کسی بات پر اپنی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تھا۔

''گھر کے ہر کام کی ذمہ داری کیا صرف آپ کی ہے۔''

دوسرے دن کے اخبار کے لیے مضمون لکھتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے تھے۔ سریتا نے نیہا کو کمرے سے چلے جانے کو کہا، آئیڈیل زندگی اور سماج سدھار کی بات لکھنے والے کو اس کی بیٹی اشاروں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرے تو...... تو کیا کرنا چاہئے؟ قلم کو پھینک دینا چاہئے یا احساس جرم سے مرجانا چاہیے...... یا کم از کم ایسی تحریر کو قلم بند کیا جائے جو بکتی ہو۔ Commercial writing وہ لٹریچر جو بکتا ہو۔ تیزی سے چلتا میرا قلم رک جاتا ہے۔ سریتا کے پتا نے ایک بار ایک فلم پروڈیوسر سے ملوایا تھا۔ جس کی لمبی چوڑی گفتگو کے بعد میں نے کہا تھا۔

''آپ جس طبقے کو سنیما گھر میں کھینچنا چاہتے ہیں میں اس طبقے کو main stream سے جوڑنے کی بات کرتا ہوں۔'' میری بات اس کی سمجھ میں آئی تھی یا نہیں مگر وہ پھر کیوں نہیں آیا یہ بات کوئی نہیں جان سکا۔ مگر اب میری بیٹی...... سریتا میرے چہرے کے آؤ بھاؤ پڑھ رہی تھی، وہ آئی اور قلم میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

نریش رسالے کی فہرست درست کر رہا تھا۔ معمول کے برخلاف نیہا بھی اب اکثر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ حالانکہ رسالے کو کل ہی پریس میں چلے جانا چاہیے تھا۔

''پاپا کے جانشین بالکل پاپا کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔''

یہ آدتیہ تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' نیہا نے پیپر پڑھتے ہوئے پوچھا۔

''مارکٹنگ سنس Marketing sense بالکل نہیں ہے۔ پہلے رسالہ پریس سے چھپ کر آجائے گا پھر سوچا جائے گا کہ اسے کہاں کہاں دیا جائے...... یا صرف تحفے میں ہی۔''

''یہ پاپا کا Devotion ہے ادب کے لیے، کاروبار نہیں''

''ادب کی خدمت واہ واہ...... گھر چلانے کے لیے بیوی تو موجود ہی ہے۔''

پل بھر میں ایک سناٹا چھا گیا۔ آدتیہ کو اپنے جملے کی تلخی کا احساس شاید ہو گیا تھا اس لیے اب وہ بے نیاز سا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیہا کا منہ کھلا ہوا تھا۔ کیا بولی تھی وہ کسی نے نہیں سنا، یا شاید خاموش رہی ہو۔

کمرے سے نکلتے میرے قدم وہیں رک جاتے ہیں۔ آدتیہ نے ٹھیک کہا ہے، ہم میں بزنس sence واقعی نہیں ہے۔ لفظوں کے جال میں الجھ کر کیا حقیقت سے منہ موڑا جا سکتا ہے۔...... اور نریش...... اس کو اپنا کیریر بنانا چاہیے...... ورنہ ایک دن...... ایک اور سریتا...... یا پھر نیہا...... نہیں نہیں، سریتا اور اب نیہا...... غریبی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہمیشہ سے ہی حساس ذہن کو appeal بھی کرتے آئے ہیں اور Attract بھی۔ حالانکہ چوبیس گھنٹے میں ایک وقت آدھا پیٹ کھانے والوں کے لیے روٹی کی کیا اہمیت ہوتی ہے وہ Health Conscious diet لینے والوں کے لیے صرف اور صرف ایک مدّا ہو سکتا ہے۔ جس پر مضمون لکھے جا سکتے ہیں۔ مباحثے ہو سکتے ہیں اور وقت آنے پر مظاہرے بھی کیے جاتے ہیں مگر...... روٹی کی اہمیت اور اس سے جڑے مسائل ہمیشہ برقرار رہتے ہیں...... آدتیہ کی بات پر سریتا کی خاموشی...... ہمیشہ اس کا دفاع کرنے والی سریتا آدتیہ کے اس جملے کو سن کر بھی ان سنا کیوں کر گئی...... کمرے میں جاتے میرے قدم اب بھی رکے ہوئے ہیں...... مگر وہ بے خبر نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے...... تو کیا آدتیہ...... میں اس کے جملے کو تولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے بیٹھے لوگ اگر جملوں کو نفع اور نقصان کے ترازو میں دیکھنا شروع کر دیں تو رشتوں کا تقدس کہاں رہ جائے گا......

بچے گا تو صرف ایک سمجھوتہ...... اور یہ جو سمجھوتہ ہوتا ہے زندگی سے...... حالات سے...... رہائش سے...... رشتوں سے اور اپنوں سے یہ بہت دکھ دیتا ہے...... بہت دکھ دیتا ہے۔ خود کو بھی...... اور اپنے سے جڑے رشتوں کو بھی...... میں باہر جانے کے لیے اپنے قدم موڑ لیتا ہوں...... حالانکہ آدتیہ کو یقین تھا کہ ابھی اس کے گال پر زور کا تھپڑ لگے گا۔ اپنے جملے کی تلخی کا احساس ہے اسے...... مگر پاپا باہر نکل گئے۔

اس گھر میں ہر کسی کو کچھ بھی بولنے کا حق ہے۔ ممی نے رسالہ میز پر سے اٹھایا۔ نریش لسٹ میں منہمک نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کاش اس جملے پر اس کو تھپڑ پڑا ہوتا۔ نیہا کاپی پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے سوچ رہی ہے۔ ممی نے اس کا جملہ سنا تھا تو پھر...... وہ رسالہ پڑھ نہیں رہی ہیں صرف الٹ پلٹ رہی ہیں...... بیٹا ماں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تو کیا ہمیشہ خاموش سی رہنے والی ماں کے دل میں بسی کشمکش کو زبان دے کر آدتیہ نے ان کے جذبات کی ترجمانی کی ہے...... ورنہ ماں آج خاموش نہ رہتی...... اس کا آج کا رویہ...... اور وہ...... کیا کر رہی ہے یہاں...... اگر وہ آدتیہ کو تھپڑ مار دے تو...... اور ماں اگر وہ ایسے ہی خاموش رہی تو...... تو یہ گھر خانوں میں بٹ جائے گا...... رشتوں کے بوجھ سے آزادی، آزادی نہیں بلکہ قربانی ہوتی ہے اور وہ یہ قربانی نہیں دے پائے گی۔ پاپا ممی اور آدتیہ...... مگر نریش...... نریش یہاں اس وقت کیا کر رہا ہے۔ کیا حیثیت ہے اس کی اس گھر میں...... اس کی موجودگی کے سب اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کی کمی جاندار تو کیا بے جان چیزوں کو بھی ہے...... میز کے بائیں طرف کی کرسی...... صوفے کا وہ کونا...... اور کھانے کی میز...... اگر وہ آنا بند کر دے تو...... پہلی بار اس نے نریش کو محسوس کرنے کی کوشش کی اور بے بس نظر آئی...... نریش کو پانے کی خواہش یا کھونے کا تصور اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا...... اگر نریش نہ ہو تو...... اس نے نظریں اٹھائیں وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''بہت گہری ریسرچ ہے'' پہلی بار وہ خاموش رہی تھی وہ مسکرایا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''کل آنا'' بولنے کے لیے الفاظ نہیں ملے تو ایک آسان سے جملے نے اس کی مشکل حل کر دی۔

''سوچوں گا۔''

''مطلب''

''کبھی کسی نے بلایا نہیں مگر آتا روز ہوں۔ پہلی بار کسی نے بلایا ہے تو سوچنا تو پڑے گا۔''

''کب تک سوچو گے۔''

''آنے تک'' سریتا نے اندر آتے ہوئے ہنستی ہوئی نیہا کو گھونسہ مارنے کے انداز میں اٹھائے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ مضمون پڑھتے ہوئے اکثر نیہا کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے نریش کو پاپا نے نوٹس کیا تھا۔ آدتیہ کو نریش کے بار بار آنے پر اعتراض تھا مگر اس کا جواز تھا کہ پاپا اس سے زیادہ نریش پر بھروسہ کرتے ہیں اور نیہا اس کو غلط ٹھہراتی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے وجہ بنا کر پیش نہیں کر پاتا تھا۔

کل نریش سے ہی اپنے جذبات بیان کر دوں گی...... نہیں رہ پاؤں گی اس کے بغیر...... نیہا نے خود کو یقین دلایا۔

نریش اور نیہا...... یعنی ایک اور سریتا...... جس سے پیار ہوتا ہے اسے ہارتا دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے، بہت دکھ...... شاید کھونے سے زیادہ...... کیا نیہا وقت رہتے یہ بات سمجھ پائے گی۔ شاید نہیں، میں خود کو مثال بنا کر اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔ اگر نہیں تو پھر نیہا......

نیہا اور نریش...... نریش یعنی میں...... میں کون ہوں...... کیا ہوں...... خلاء میں جیتا ایک شکست خوردہ انسان...... جو تالیاں بٹور سکتا ہے...... مجمع اکٹھا کر سکتا ہے۔ مگر گھر میں اپنے ہی بیٹے اور بیٹی کے سوالوں کا سامنا کرنے کے بجائے وہاں سے واپس مڑ جاتا ہے۔ ہر گھڑی ہارتا ہے...... پھر بھی زندہ رہتا ہے...... کیا نریش یہ بات سمجھے گا۔ خود کو ہارا ہوا ثابت کر کے میں اسے اپنی نظروں میں اٹھنے کا ایک موقع تو دے سکتا ہوں۔

دوسرا دن روز کی طرح ایک عام دن تھا۔ مگر کہیں کچھ کمی تھی...... کیونکہ روز ایک

خاص وقت پر آنے والا نریش نہیں آیا تھا۔سب کو احساس تھا......اس کی کمی کو سب نے محسوس بھی کیا تھا...... بجنے والی ہر گھنٹی پر یقین ہوتا کہ نریش ہے۔مگر وہ نہیں آیا۔دودھ والا رات نو بجے تک آجاتا ہے،آج وہ بھی نہیں آیا تھا۔سب نے بار بار کلائی گھڑی سے دیوار گھڑی کی سوئی ملائی تھی۔دس بجے کے آس پاس گھنٹی بجی،کون ہوگا......سب نے قیاس لگایا،نریش ہی ہوگا......آدتیہ کو یقین تھا......آج ساری باتیں صاف صاف ہوں گی۔جو بھی کہنا ہے سب کہہ دوں گی نریش سے...... نیہا نے دل میں دہرایا۔نریش کو سمجھانا ہوگا۔نیہا کے لیے یہی بہتر ہے۔بس آج کے بعد اس کا آنا جانا بند...... پاپا کا ہر کام اب میں کروں گا مگر نیہا کو......آدتیہ نے دروازہ کھولا،اور دیر سے رکی لمبی سانس چھوڑتے ہوئے پر سکون آواز میں بولا''دودھ والا''

دوسرے دن اتوار تھا۔ناشتہ دیر سے ہوا۔سب چائے پی رہے تھے۔دروازہ کھلا تھا۔نریش اندر آیا۔اس کے ہاتھ میں رسالے کا مسودہ تھا۔اسے میز پر رکھنے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔سریتا نے چائے کا مگ اسے تھمایا۔

''نریش رسالے سے زیادہ تم کو اپنے کیریر پر توجہ دینی چاہیے۔''بغیر کسی تمہید کے سریتا نے جھکی جھکی نظروں سے کہا۔

''ہاں نریش......سریتا ٹھیک کہہ رہی ہے۔اس کرسی کے بجائے تم وہاں صوفہ پر بیٹھو۔''بغیر کچھ سمجھے وہ کھڑا ہوگیا۔پاپا نے کرسی ہٹادی۔وہ نیہا کی طرف مڑا۔مگر آدتیہ سامنے تھا۔کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ ماں کے بازو ہلاتی ہے۔

''ممّا......پاپا آپ۔''

''تمہیں نیہا چاہیے یا ایک اور سریتا۔''پاپا کی تیز آواز کمرے میں گونجتی ہے اور گونجتی رہتی ہے۔

☆☆

درار

''ڈاکٹر مریض کو ہوش آرہا ہے۔''

میرے کانوں کو یہ آواز بہت صاف سنائی دی۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی، پہلے سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آیا پھر ایک ایک کر کے سارے مناظر صاف ہونے لگے۔ اسپتال کا کوئی کمرہ تھا کیونکہ آس پاس Medical Equipments رکھے ہوئے تھے۔ کیا ہوا تھا مجھے......؟ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا...... گھر...... گھر میں رہنے والے افراد...... کہیں میری یادداشت تو غائب نہیں ہوگئی...... مجھے خوف آنے لگا...... کیا میں سب کچھ بھول چکا ہوں...... ہاں...... نہیں۔

''عموماً گہرے شاک کی وجہ سے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر گپتا کہہ رہے تھے، شاید پاس کھڑے کسی ڈاکٹر سے یا پھر نرس سے۔

شاک...... کیسا شاک...... کیا ہوا تھا مجھے......؟ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا میری یادداشت ٹھیک تھی ورنہ میں اپنے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر گپتا کی آواز کیسے پہچان لیتا۔ مگر چاروں طرف پھر اندھیرا چھانے لگا۔

''سسٹر! مریض کو ابھی Under Observation رکھا جائے۔ یہ پوری طرح

ہوش میں نہیں ہیں۔'' کیس شیٹ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔

لرزتی پلکوں پر زندگی کے اثرات محسوس کرتے ہی نرس ادھر متوجہ ہوئی۔

''سر! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

دھندلے سے کئی نقش آس پاس ابھرے۔ میں نے لب کھولنے کی کوشش کی مگر آواز نکلی ہی نہیں۔

''اب آپ بہتر محسوس کر رہے ہوں گے۔'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی قیاس کیا اور پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''تھوڑا سا پانی پی لیں۔'' اس نے اٹھنے میں میری مدد کی اور پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا یا۔

''گڈ'' وہ مسکرائی۔

پتہ نہیں اس کی مسکراہٹ اصلی تھی یا اس کے کام کا ہی ایک حصہ، مگر جیسی بھی تھی مجھے اچھی لگی۔

''مجھے کب ڈسچارج کیا جائے گا؟''

''آپ کی طبیعت بہتر ہو رہی ہے۔ بس ایک دو دن اور آرام کی ضرورت ہے۔''

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھنا چاہا مگر آواز میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی میرے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے شاید اس نے سوال کا اندازہ کر لیا۔

''کبھی کبھی شاک کی وجہ سے ایسی حالت ہو جاتی ہے مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آپ ہمت رکھیں۔'' اس نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔

شاک...... شاک...... میں تو بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں...... پھر میری یہ کیفیت کیسے ہو گئی۔ بڑے سے بڑا غم...... اور پریشانی میں آسانی سے جھیل جاتا ہوں...... مگر میرے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ سے کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ میں کن طوفانوں سے گزرا ہوں۔ جذبات کی آندھی میں مَیں کبھی نہیں بہا...... پھر یہ شاک......؟

ایک چھوٹے سے جنرل اسٹور کو ایک انڈسٹری میں تبدیل کرنے کے لئے میں

نے ہر وہ حربے آزمائے اور ہر وہ چالیں چلیں جو ترقی کی بساط پر مجھے کامیابی دلا سکے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ان کی کامیابی کے پیچھے کسی کی دعائیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت اور لگن سے آگے بڑھا ہے تو کوئی اسے پراپر پلاننگ بتاتا ہے۔ مگر میری کامیابی کا راز میری پریکٹیکل اپروچ ہے۔ میرا ہر قدم بہت نپا تلا ہوتا ہے۔ میں اپنے ہر عمل کو نفع اور نقصان کے ترازو میں تولنے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھاتا آیا ہوں۔ اسی لئے میں نے اپنی زندگی میں بہت کم غلطیاں کی ہیں اور اگر غلطی ہو بھی گئی تو میں اس پر پچھتانے کے بجائے اسے بھول جانے کو ترجیح دیتا آیا ہوں۔ اس لئے لوگ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حسد کی نظر سے بھی۔ مگر میں اس میں الجھنے کے بجائے اور آگے بڑھنے پر یقین رکھتا ہوں اور یہ میری خوش قسمتی ہی رہی کہ میری بیوی سدھا میری زندگی میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی وہ کالج میں میری جونیئر تھی اور میں نے اس کے اندر چھپی صلاحیتوں کو پہلے ہی دن پہچان لیا تھا۔ سادگی اور قناعت کی پیکر، اس لڑکی میں مجھے اچھی بیوی کے وہ تمام گر نظر آئے جو گھر کو مکمل آسودگی اور خوشگواری کا نمونہ بنا دیتے ہیں اور سدھا نے واقعی گھر کو جنت بنا دیا۔ میں جب بھی گھر آتا مجھے پیار کی شبنم، سکون اور اطمینان کی بوچھار ملتی۔ گھر کی تمام الجھنیں اور پریشانیاں اس نے اپنے شانوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ اور مجھے Casanova سمجھنے والے میری گھریلو خوشگوار زندگی دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ اپنے بیٹے سمیر کو ہم نے ہوسٹل بھیج دیا، بیٹی کی کمی اوپر والے نے شالنی کے روپ میں پوری کر دی تھی۔ وہ سدھا کی سہیلی کی بیٹی تھی اور ایک Air crash میں بھگوان نے اس سے ماں اور باپ دونوں ہی چھین لئے تھے۔ خوبصورت گول مٹول سی شالنی کو جب سدھا گود میں اٹھاتی تو وہ ہماری ہی بیٹی لگتی اور ہمارا گھر سنسار مکمل لگتا۔

"اب آپ بالکل ٹھیک ہیں مگر ابھی ایک دو دن ہم آپ کو اپنا مہمان بنا کر ضرور رکھیں گے۔" ڈاکٹر گپتا نے اسٹیتھو میرے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر! میرے خیال میں اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے گھر جانا چاہئے۔"

"گھر"...... زبان پر یہ لفظ آتے ہی ایک کے بعد ایک منظر صاف ہوتے گئے اور ان چند لمحوں نے مجھے ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے لیا جس نے مجھے موت اور زیست سے ہمکنار

کیا تھا۔ میرے سوئے ہوئے اعصاب ایک دم بیدار ہو گئے اور لعنت وملامت کا یہ وقت پھر مجھ سے سوال کرنے لگا۔ یہ کیوں ہوا...... کیسے ہوا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہونے لگا۔

میں شام کو آفس سے تھکا ہارا واپس لوٹا تو سدھا کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ شانے پر پھیلے ریشمی بال اور لہراتے ہوئے سراپے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اشارے سے میں نے سدھا سے پوچھا کہ کون ہے؟

''نہیں پہچان پائے نا۔ میں بھی دھوکہ کھا گئی تھی۔ ایک منٹ کے لئے آنکھیں بند کیجئے، پھر پتہ چلے گا کہ کون ہے۔'' سدھا بہت خوش تھی۔ اس کے کہنے پر میں نے آنکھیں بند کیں۔

''آنکھیں کھولئے انکل۔'' میرے گلے میں بانہیں ڈالے دوسرے ہی لمحے شالنی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے جسم کی گرمی اور خوشبو نے لمحوں میں اسے بیٹی کے بجائے صرف ایک لڑکی بنا دیا اور میں اس کے خدوخال میں ڈوب گیا۔

''آپ نے تو اسے چار سال بعد دیکھا ہے۔ میں نے تو پچھلے ہی سال دیکھا تھا مگر پہچان نہیں سکی۔ اب تو ہوسٹل سے ہر دو مہینے بعد آیا کر۔'' وہ شالنی کو گلے لگائے پیار سے کہہ رہی تھی۔

''اب میں ہوسٹل جاؤں گی ہی نہیں بلکہ جاب کروں گی۔'' شالنی لاڈ سے کہہ رہی تھی۔

''نوکری تو سسرال جا کر کرنا۔ ہم تمہاری شادی جلد ہی کر دیتے ہیں۔ کیوں سدھیر......؟'' سدھا نے مجھے مخاطب کیا تو میں کسی خواب کی سی کیفیت سے جاگا اور ہوں ہاں کرتے ہوئے کمرے میں چلا آیا۔

بریف کیس رکھ کر میں آئینہ کی طرف مڑا، مگر وہاں تو......

شالنی یہاں کیا کر رہی ہے میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر وہ تو سدھا کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ دونوں ہی بولتی رہیں میں خاموش تھا۔ مگر ایک نظر شالنی پر ضرور ڈال لیتا جسے سدھا طرح طرح کی چیزیں کھلانے میں مشغول تھی۔

''آنٹی آپ اس طرح کھلاتی رہیں تو میں موٹی ہو جاؤں گی۔''

''......اور پھر تمہیں کوئی پسند نہیں کرے گا۔ یہی فکر ہے نا تجھے اور ابھی شادی کے لئے منع کر رہی تھی۔ دیکھا سدھیر......''سدھا نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

''انکل کو شاید بزنس کی کوئی ٹنشن ہے۔''میری طرف سے شالنی بولی۔

''یہ تو ان کا روز کا معمول ہے، بزنس اور صرف بزنس۔''

سدھا سو چکی تھی۔ شالنی کا کمرہ بند تھا۔ پتہ نہیں وہ سو رہی تھی یا پھر جاگ رہی تھی۔ میں نے کئی چکر کاٹے پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں لیٹے رہنے کے باوجود مجھے شالنی کا بیڈ پر لیٹنے کا انداز اور اس کے واضح خدوخال نظر آ رہے تھے......اب شاید اس نے کروٹ لی ہو......اور اب......پانی پینے کے لئے میں نے گلاس اٹھایا۔ وہیں پر میری، سدھا، شالنی و سمیر کی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ آٹھ دس سال کی شالنی میرے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑی ہے ''شالنی میری بیٹی ہے''میں نے بے اختیار فوٹو چوم لیا۔

صبح میں لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا جبھی سدھا چائے لے کر آئی۔ ''شالنی کے لئے کوئی لڑکا دیکھ کر ہمیں اسکی شادی کر دینی چاہئے۔''میرے منہ سے یہ پہلی بات سن کر اس نے تعجب سے مجھے دیکھا اور محض اس ڈر سے کہ ٹاپک بدل نہ جائے وہ جلدی سے بولی۔

''اور کیا اس کی پڑھائی ختم ہو چکی ہے۔ میں نے کتنی بوا سے کہہ دیا ہے۔ آپ بھی اپنے ملنے جلنے والوں میں ذکر کریں ورنہ آج کل تو لڑکے والے......''

''گڈ مارننگ انکل آنٹی......کوئی خاص ڈسکشن چل رہا ہے، میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا۔''

ڈھیلی سی ٹاپ اور جینس پہنے بالوں کو کلپ میں پھنسائے وہ چہک رہی تھی۔ یہ شالنی ہے میری بیٹی......میں نے دانستہ اپنے آپ کو یاد دلایا۔ میرے دل میں کیا ہے اگر سدھا نے جان لیا تو......میری باہر کی مصروفیات اور Casanova والی امیج سے وہ واقف ہے۔ بلکہ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی ایک فنکشن سے لوٹتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''یہ منگل سوتر اور سیندور صرف شریر کو سجانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ یہ ہمیں

اعتبار دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔''

''تمہیں کوئی شک ہے۔'' میں نے اسپیڈ بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا۔''نہیں کرنا چاہئے نا۔ٹھیک ہے۔اب میں.....''

''شادی اعتبار کا بھی دوسرا نام ہے۔ جو صرف تمہیں ملا ہے۔ڈگمگانے سے پہلے یہ یاد رکھنا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اسی دن سے وہ مطمئن ہوگئی تھی۔آفس اور آفس کے باہر کی مختلف لڑکیوں سے میرے تعلقات رہے مگر اس نے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔پتہ نہیں یہ اس کا یقین تھا کہ اعتماد.....مگر کبھی وہ نوبت نہیں آئی کہ ہمارا اعتبار ڈگمگاتا اور مجھے اس کے سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا۔مگر..........

ان دودنوں کی جو کیفیت میری تھی اگر اس کا اندازہ بھی سدھا کو ہوجاتا تو شاید قیامت آجاتی۔میں ایسی ہی کسی کیفیت کو ٹالنے کے درپے تھا اور آفس کے کام سے چار دنوں کے لئے باہر چلا گیا۔

نئی جگہ نئے کام نے مجھے نارمل ہونے میں بہت مدد کی۔فرصت کے اوقات میں مَیں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا.....بھگوان سے توبہ بھی کی اور ایک نئے جذبے کے ساتھ گھر واپس آگیا۔

شالنی شاید کہیں گئی تھی۔میں نے دانستہ سدھا سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا۔نہا کر باہر آیا تو سدھا کھانا لگا چکی تھی۔

''کل کتنی بوا آئی تھیں۔شالنی کے لئے ایک لڑکا بتایا ہے، انجینئر ہے، اچھی نوکری پر ہے۔کسی دن ان لوگوں کو.....''

سنتے ہی میرے پھندا لگ گیا۔سدھا بولنا بند کر کے میری پیٹھ سہلانے لگی۔

''آپ کو کھانے کی ہمیشہ جلدی رہتی ہے دھیرے دھیرے کھانا چاہئے۔'' ابھی اس کا لکچر اور لمبا ہوتا مگر کوئی آگیا اور بات ختم ہوگئی۔

چائے دیتے ہوئے سدھا نے لڑکے کی تصویر دکھائی۔لڑکا اسمارٹ تھا مجھے اچھا لگا۔

''بوا کو فون کر کے کل ڈنر پر بلا لیتے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔''میں نے ہاں میں ہاں ملائی اور سدھا فون کرنے لگی۔ میں ایک بار پھر فوٹو دیکھنے لگا۔ جوڑی اچھی ہے۔ میرے دل نے کہا۔

''انکل میں آپ کے آنے سے پہلے ہی آنا چاہ رہی تھی مگر ٹینا نے مجھے آنے ہی نہیں دیا۔ آپ کیسے ہیں۔ ٹور کیسا رہا۔''اس نے بانہیں پھیلائیں اور مجھے لگا کہ کسی نے مجھے رسیوں سے جکڑ دیا ہو۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

''کیا ہوا''شالنی نے محسوس کیا تھا۔

''کچھ نہیں''کہتے ہوئے میں نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ میں پھر بہک رہا تھا۔ شالنی......

''کنتی بوا کل سات بجے تک لڑکے والوں کے ساتھ آئیں گی۔''سدھا نے مجھے مخاطب کیا۔

''چلو میں تمہارے کپڑے اور جویلری دیکھوں کل بہت کام ہوگا۔''وہ شالنی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ شالنی نے کچھ نا سمجھتے ہوئے مڑ کر مجھے دیکھا۔ مگر میں نے نظریں جھکا لیں اور پھر وہیں بیٹھ گیا۔ سامنے ہی لڑکے کی فوٹو رکھی تھی۔ دل میں آیا کہ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینک دوں۔

سدھا بہت جوش میں تھی۔ میں آنکھیں بند کئے بیڈ پر لیٹا تھا تبھی دروازہ کھلا۔ سدھا اور شالنی اندر داخل ہو رہی تھیں۔

''تمہارے سب سوٹ بیکار ہیں۔ بس میں نے کہہ دیا کہ تم کو ساڑی پہننی ہے تو پہننی ہی پڑے گی۔ لو سلکٹ کرو۔''وارڈ روب کا دروازہ کھولے سدھا ایک کے بعد ایک ساڑیاں نکال رہی تھی اور شالنی اس کو اپنے اوپر رکھ کر دیکھ رہی تھی۔

''بہت بھاری ہے یہ سب آنٹی۔''

''کچھ بھاری نہیں ہے۔ یہ فیروزی ساڑی دیکھو یہ بہت اچھی لگے گی۔ کیوں سدھیر دیکھو۔''میں ترچھی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سدھا نے مخاطب کیا تو گھبرا کر اٹھ گیا۔

''انکل دیکھئے'' وہ پلّو سر پر ڈالے ہوئے تھی۔ ایسی تو وہ کبھی لگی ہی نہیں تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

''بس یہی ساڑی ٹھیک ہے۔'' سدھا نے کہا اور باقی ساڑیاں وارڈ روب میں رکھتے ہوئے اسے مسلسل کچھ بتا رہی تھی۔

شالنی کی شادی ہو جائے گی اور وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی مجھے عجیب سا لگا اور وہ فوٹو والا لڑکا...... اس کا خیال آتے ہی منہ کڑوا ہو گیا اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔ شالنی کے کمرے میں لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے جھانکا وہ اوندھے منہ لیٹی شاید اس لڑکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں واپس بیڈ پر آ کر کتنی ہی دیر اس آگ میں جلتا رہا اور پھر سو گیا۔

صبح اٹھا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ سدھا تیار تھی۔

''کہاں جا رہی ہو۔''

''مندر جا رہی ہوں پوجا کرنے۔ بس شام کو سب ٹھیک رہے۔ چائے آپ کو شالنی دے دے گی، اسے جگا کر آئی ہوں۔ رامو کو میں نے منڈی بھیجا ہے۔ سبزیاں لانے۔'' پوجا کی تھالی سجاتے ہوئے وہ بولی۔

سدھا مندر گئی ہے...... رامو منڈی۔ ایک عجیب سی بات میرے ذہن میں آئی۔ شام کو لڑکے والے آئیں گے۔ اگر انہوں نے شالنی کو پسند کر لیا تو...... اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مالی اور چوکیدار باہر ہیں...... صرف میں اور شالنی...... ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔ میرا دل مجھے اکسانے لگا...... میں نانا کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گیا۔ جہاں فیروزی ساری کا پلو سر پر ڈالے شالنی پہلے سے موجود تھی میں باہر آ گیا۔ دھیرے دھیرے صحیح اور غلط کا پہلو میرے دماغ سے نکلتا رہا اور میں انسان سے حیوان بننے لگا۔ میرے چاروں طرف صرف شالنی تھی۔

''انکل چائے بن رہی ہے۔ لان میں آ جائیں۔'' شالنی کی باہر سے آواز آئی اور پھر اس کے قدم شاید کچن کی طرف بڑھ گئے۔

''نہیں...... نہیں۔'' میں نے زور سے ہاتھ مارا اور میز پر رکھا گلاس نیچے گر گیا۔

''ابھی آپ بالکل ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ کسی گہرے شاک سے آدمی کی حالت اکثر ایسی ہو جاتی ہے۔ شالنی آپ کی بیٹی ہی تھی...... اور وہ سب آپ کے سامنے ہوا۔ اس لئے بھولنا ذرا مشکل ہوگا۔ مگر آپ حوصلہ رکھئے۔ سدھا بھابھی آپ ہی ان کو سمجھائیے۔'' ڈاکٹر نے سدھا کو مخاطب کیا تب بھی میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔

''مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ وہ بس ایک بار مجھ سے کہہ دیتی۔ بیٹی تھی میری۔ مگر کچھ کہنے کے بجائے چلی گئی۔''

سدھا زار و قطار رونے لگی۔

اور میں میں کیا کرتا۔ بھلا عیاشی کی اس سے بھدی مثال اور کوئی ہو سکتی تھی۔ شاید میری زندگی کا باقی بچا ہر لمحہ مجھے اور میرے ضمیر کو پکار پکار کر فریاد کرتا رہے گا اور حساب مانگے گا اس صبح کا جو میری زندگی کی بدترین صبح بن کر رہ گئی تھی۔ جس نے مجھے حیوان بنا دیا...... نہیں نہیں میں حیوان صرف کچھ لمحوں کے لئے بنا تھا...... اگر میں صرف حیوان ہوتا تو شاکڈ کی سی کیفیت سے میں کبھی نہ گزرتا۔ بلکہ اپنے اس بھیانک راز کی خود بہ خود پردہ پوشی ہو جانے پر خوش ہوتا اور مطمئن زندگی گزارتا مگر چونکہ میں واقعی انسان ہوں اس لئے یہ لمحے مجھ پر بہت بھاری ہیں اور میرے انسان ہونے پر مجھے کچوکے لگا رہے ہیں۔ نہیں نہیں...... میں انسان نہیں ہوں...... میرے اندر کا حیوان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ مگر میں شاید انسان ہی تھا اس لئے مصلحت میرے آڑے آگئی۔ میں نے اپنے کو بہت مصروف کر لیا مگر فرصت کے جو چند لمحے مجھے میسر آتے وہ میرے لئے برچھی کی طرح ہوتے...... اور میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو پرسکون رکھتا کہ میں واقعی انسان ہوں...... مگر وہ صبح مجھے اب بھی شاکڈ کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ جب شالنی میرے لئے صرف ایک لڑکی بن گئی تھی۔

کچن میں شالنی چائے بنا رہی تھی میں دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا وہ بہت خوش لگ رہی تھی اس کی گنگنانے کی آواز مجھے صاف تو نہیں آ رہی تھی مگر میں سن رہا تھا۔ کپ رکھنے کے بعد اس نے چائے کی پتی کا ڈبہ اٹھایا ہی تھا کہ میرے اندر کا شیطان باہر آ گیا اور

میں نے اندر جا کر بانہیں اس کی کمر میں ڈال دیں۔ کچھ سیکنڈ تو وہ شاید سمجھ ہی نہیں سکی پھر میرے ارادے کو شاید اس نے اپنے چھٹی حس سے بھانپ لیا تھا میری گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں وہ مڑی اور اب اس کا چہرہ میرے سامنے تھا...... وہی چھوٹی سی آٹھ...... دس سال کی شالنی میرے سامنے تھی، اس کی آنکھوں میں حیرت، نفرت، تعجب، رحم اور زندگی کی اتنی چمک اور اتنے سوالات تھے کہ میرے اندر کا حیوان یکا یک دم توڑنے لگا...... میرے ہاتھ کپکپانے لگے...... ماتھے پر پسینہ آ گیا، مگر میری گرفت ڈھیلی ہونے کے باوجود اس نے بھاگنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

''انکل......'' اس کی سہمی سی آواز آئی اور میں اسے چھوڑنے ہی والا تھا کہ وہ فوٹو میرے سامنے آ گئی۔ ''شالنی کسی اور کی ہو جائے گی......'' میرے اندر سے پھر ایک آواز آئی۔ ''نہیں نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا...... میرے ہوتے ہوئے شالنی...... اور اگر سدھا کو پتہ چل گیا تو......'' قریب ہی شیلف پر بڑی سی چمک دار چھری رکھی تھی، بے ارادہ میں نے اسے اٹھا لیا۔ ''اگر شالنی میری نہیں ہو سکتی تو پھر کسی کی نہیں......'' اور میں نے پوری طاقت سے وہ چھری شالنی کے اندر کر دی، خون کا فوارہ ابل پڑا...... یہ کیا ہو گیا۔ میں ہوش میں آیا۔ چھری اس کے جسم سے نکالی اور خود کو مارنے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور چھری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ''نہیں انکل'' اس کی کپکپاتی آواز آئی اور وہ زمین پر گر گئی میں بے اختیار چیخ پڑا، مالی اور چوکیدار کے ساتھ رامو بھی اندر آیا تھا۔ چھری شالنی کے ہاتھ میں تھی جس پر اس کی انگلیوں کے نشان باقی تھے...... میں قانوناً تو بچ گیا مگر میرا ضمیر مجھے دھتکار رہا تھا۔ کاش کہ میں اس وقت خود کو ختم کر لیتا یا پھر اس جرم میں مجھے پھانسی کی سزا ہو جاتی تو میرے دل کا بوجھ ختم ہو گیا ہوتا۔ مگر شالنی کی دی ہوئی یہ زندگی میرے لئے موت کی سزا سے بدتر تھی...... اور میں یہ سب برداشت نہیں کر پایا...... میری حالت بگڑتی رہی اور چونکہ میں بہر حال انسان ہوں اس لئے اپنے اس عمل کو نہ تو گلوری فائی ہی کر سکتا ہوں اور نہ ہی مثالی کہہ سکتا ہوں۔

☆☆

اپنا انصاف

کھچا کھچ بھری عدالت کے کمرے میں چہ می گوئیاں شدت سے ہو رہی تھیں۔ شاید صرف میں ہی خاموش اور خالی الذہن ہو کر رہ گیا تھا۔ انتظار تھا تو صرف جج کا، جو چند لمحوں میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر میری پھانسی کا حکم سنائے گا اور قانون کی بالادستی پر مہر لگا دے گا۔ اور مجھے اذیت بھری اس زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹی مل جائے گی۔ میرے وکیل نے بار بار حقیقت جاننے کے لئے مجھے اکسایا تھا۔ کبھی میری باقی زندگی کا حوالہ دیا تھا تو کبھی اصل مجرم کو سزا دلانے کا وعدہ اور کبھی میرے گھر والوں کا واسطہ، مگر میں نے ان باتوں پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ کبھی کچھ سوچا تھا۔ سوچتا بھی کیا؟ میری سوچ اور میری حرکت کبھی جیسے گروی رکھ دی گئی ہوں۔ ایک طرح سے میں نے سوچنے سمجھنے کا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ بہت چھوٹا تھا تبھی سے ماں جنگل میں لکڑیاں اکٹھا کرنے کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے جاتی تھی، تھوڑا بڑا ہوا تو میں اکیلا ہی لکڑیاں لے کر آتا، انہیں آنگن میں پٹکتا اور گلی ڈنڈا کھیلنے نکل جاتا۔ روٹی بن جاتی تو ماں باپو کے آتے ہی ہم کو روٹی پروس دیتی۔ ہم سب کھانے پر ٹوٹ پڑتے۔ جو جتنا زیادہ کھالیتا۔ وہی اس کی جیت ہوتی۔ شام کو چوری چھپے ہم گاؤں کے باہر ہو رہے ناٹک نوٹنکی یا پھر میلے میں چلے جاتے۔

اس دن شہر سے ناٹک منڈلی آئی تھی۔ ترنگا جھنڈا اور آزادی کی لڑائی کا ذکر...... بار بار گاندھی نہرو اور پتہ نہیں کس کس کا نام لے رہے تھے وہ لوگ...... ہمارے تو کچھ پلّے ہی نہیں پڑا۔ واپسی میں ہم سب دوست اس کا خوب مذاق اڑاتے رہے...... راستے میں پڑی چھوٹی چھوٹی لکڑیوں پر کاغذ کے ٹکڑے اور پلاسٹک چپکا کر، جھنڈے جیسا بنا کر ہم ''جے ہند...... جے ہند'' اور ''بندے ماترم'' چیختے، چلّاتے، ہنستے اور کھیلتے گھر آ گئے۔

''یہ کیسا شور تھا؟'' گھر میں داخل ہوتے ہی دادا جی نے پوچھا۔

''دادا جی ہم سب جے ہند...... جے ہند بول رہے تھے۔'' ان کی کھاٹ کے نیچے بیٹھتے ہوئے میں بولا۔

''ارے وہ نیا ناٹک دیکھ آئے کیا؟ آزادی والا۔ اس میں ایسا بول رہے تھے سب۔'' باپو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اس میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر جے ہند، جے ہند بول رہے تھے۔'' میں نے خوش ہو کر بتایا۔

''کیا...... آزادی کو تم لوگ ناٹک بتا رہے ہو، اور اس کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہو۔ جے ہند اور بندے ماترم کا مذاق بنا رہے ہو۔'' دادا جی ہانپتے ہوئے بیٹھ گئے، اور ان کے بدلتے تیور دیکھ کر ہم سب کھڑے ہو گئے۔

''ارے آزادی...... تم سب اس کو ناٹک میں کھیلنے کی چیز سمجھتے ہو؟ ہنستے ہو...... ارے ان سے پوچھو جنہوں نے آزادی کے لئے اپنی جان قربان کر دی...... لٹا دیا سب کچھ...... خاندان بکھر گئے جن کے۔ بندے ماترم کا بول ایک نیا جوش اور ولولہ بھر دیتا تھا دلوں میں اور سب کچھ چھوڑ کر دیش کے لئے جینے کا حوصلہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھو زندگی کا لمبا حصہ جیل میں گزرا۔ انگریزوں کے ڈنڈے کھائے...... پھر کہیں تم لوگ اس آزاد دیش کے باسی بنے۔ اوپر والے نے ہمیں آزادی تو دے دی مگر پتہ نہیں تم لوگ اسے سنبھال بھی پاؤ گے یا پھر......''

دادا جی کا جوش دیکھتے ہی بن رہا تھا، اور میں نے اس چھوٹی سی عمر میں ہی فیصلہ

کرلیا کہ جس آزادی کو پانے کے لئے ہمارے دادا جی جیسے لوگوں نے اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں ہم اسے محض ناٹک یا کہانی نہیں بننے دیں گے بلکہ اس کی رکھشا اور حفاظت ہم سب کا فرض ہوگا۔

اور یہی خیال دل میں لئے میں بڑا ہوتا گیا۔ایک چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے جوجھتے ہوئے...... پیڑ کے نیچے ماسٹر جی سے سبق لیتے ہوئے دیش بھگتی کا جذبہ میرے ذہن میں پلتا رہا اور دیش سیوا کے لئے میں خود کو تیار کرتا رہا۔ بی۔اے کی پڑھائی مکمل کر کے میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ الیکشن کا اعلان ہو گیا۔ ہمارے گاؤں میں بھی چہل پہل بڑھ گئی۔ جھنڈے لگی جیپ کے پیچھے میں بچپن سے بھاگتا آیا تھا۔ کئی بار سواری بھی کی تھی۔ زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے بھی لگائے تھے۔ مگر ان سب باتوں کے بجائے میری توجہ اب ان کی باتوں پر تھی اور وعدوں پر۔ گاؤں والوں کے حالات سدھارنے کا جذبہ اور دیش سیوا کے لئے کچھ کرنے کی خواہش اور حوصلہ اپنے اندر جگائے میں کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا اور وہ موقع مجھے مل گیا۔ بابو رام پرساد کے بھاشن نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ میں ان کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ ان کے لئے کام کیا اور ان کے جیتنے کی خوشی میں اپنے پیسے سے گاؤں بھر میں لڈو بانٹے۔ اور ان سے ملنے ان کی پارٹی آفس کے باہر لگی لمبی لائن میں کھڑا ہو گیا۔ وہ جانے کے لئے باہر نکلے۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف مڑے، میرے کندھے کو تھپتھپایا اپنی جیت کا سہرا میرے سر باندھا اور ان کا ایک ہی جملہ۔

"تم جیسے نوجوانوں کی آج دیش کو ضرورت ہے۔" مجھے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا یا گیا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، گاؤں میں ان کے کئے وعدوں کو دہراتا وہ گاڑی میں بیٹھے اور دلّی جانے کے لئے ایر پورٹ چلے گئے، کیونکہ دو چار دنوں میں ہی حکومت بنی تھی۔ ہر ڈھابے اور چوراہے پر کھڑے لوگ یہی باتیں کرتے کہ کون کون منتری بنے گا۔

حکومت بنی۔ رام پرساد جی منتری بنادئے گئے۔ ہاروں اور مالاؤں کے بوجھ تلے دبے چار پانچ دن بعد وہ لوٹے۔ ملنے والوں سے زیادہ بھیڑ پولیس اور سیکورٹی کی تھی۔

''جو خود اپنی رکھشا نہ کر سکتا ہو وہ بھلا دیش والوں کے لئے کیا کر پائے گا؟'' میرے پاس کھڑے پارٹی کے پرانے کرتا دھرتا ورما جی نے مجھے مخاطب کیا۔

''زمانہ ہی ایسا ہو چلا ہے۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ دوست اور دشمن کا کچھ پتہ نہیں۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کی بات پر سر ہلایا۔

''لگتا ہے آج منتری جی سے ملاقات نہیں ہوگی۔'' میں پنجے کے بل اچکتا ہوا بولا۔

''بس منتری جی ایک بار مجھے دیکھ لیں تو فوراً بلا لیں گے۔ ہمارے گاؤں سے میری وجہ سے ہی ان کو پورے ووٹ ملے ہیں۔'' اپنا رعب ڈالنے کے لئے میں نے اپنی اہمیت بتائی۔

میں ذرا سا آگے بڑھتا تو پولیس والے مجھے پھر پیچھے کر دیتے۔ پوچھنے پر پتہ چلتا کہ کبھی صاحب میٹنگ میں ہیں تو کبھی دلی سے بات ہو رہی ہے اور پھر نیتا جی کو کہیں جانا ہو گیا۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں گزریں اور تھوڑی دیر بعد وہ جگہ ویران ہو گئی۔ میں بھاری قدموں سے اسی شام کی بس سے گاؤں لوٹ آیا۔

گھر آتے ہی میرے چاروں طرف بھیڑ لگ گئی۔ جیسے میں ہی منتری بن گیا ہوں۔ اور طرح طرح کے سوال ہونے لگے۔

''پانی کب تک آئے گا؟ بجلی کے تار کب کھنچیں گے؟ اسکول کی عمارت کا کیا ہوا؟ ڈاکٹروں کی سہولت کب تک ملنے لگے گی؟'' وہ سارے ہی وعدے سوال بن کر میرے سامنے تھے اور میں جھوٹی تسلیاں دے کر ان سے اپنا دامن بچاتا اور اس ڈر سے، کہ کم از کم لوگوں سے ملاقات ہو، میں گھر میں ہی قید ہو کر رہ گیا۔ اور آگے کے پلان بناتا اور بگاڑتا رہا۔

وہ پتہ نہیں کون سی گھڑی تھی جب منتری جی کے آفس سے ایک آدمی میرے نام کی چٹھی لے کر آیا۔ انہوں نے مجھے فوراً پارٹی آفس بلایا تھا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ رام پرساد جی کی باتوں پر میں نے یونہی بھروسہ تھوڑی کر لیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو داد دی۔ گاؤں میں عزت بچی رہنے کی خوشی الگ تھی اور میں کھڑکھڑاتا کرتا پائجامہ پہن کر پارٹی آفس پہنچ گیا۔ وہ کسی میٹنگ میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلایا۔ گاؤں کے مسائل خود ہی

دہرائے اور انہیں جلد از جلد پورا کرنے کا یقین دلایا۔ اور میں ان کی نیک دلی پر نچھاور ہو گیا۔

جاتے جاتے انہوں نے مجھے اپنا پرسنل سیکریٹری اپوائنٹ کیا تو میرے اپنے کئی مسئلے حل ہو گئے ان کی ترقی کے لئے میں نے خلوص کے ساتھ دعا کی۔

گاؤں والے ساری باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور میں اپنا سامان لے کر شہر کے ریسٹ ہاؤس آ گیا۔ میری دنیا ہی جیسے بدل گئی تھی۔ اب میں تھا اور پورا شہر جیسے میرے پیچھے لگ گیا ہو۔ صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا لگا رہتا۔ میری میز پر فائلوں کا انبار لگ گیا۔ میں ان کے نوٹ بناتا۔ جو کام میں خود کروا سکتا تھا وہ پورا کرتا۔ اس کے علاوہ ڈھیروں اور کام میرے ذمے تھے منتری جی کا پرسنل سیکرٹری ہونے کے ناطے ان کی اپوئنٹمنٹ فکس کرنا اور ان کی تقریریں لکھنا...... اور منتری جی تو مجھ پر اتنے زیادہ منحصر تھے کہ ان کی منسٹری کے کام کی دیکھ بھال میں مجھے دلّی بھی جانا پڑتا۔ اکثر دوروں پر میں ہی ان کے ساتھ رہتا۔ یہاں تک کہ گاؤں کی فائل دوسری بے شمار فائیلوں کے نیچے دبتی گئی۔

اس دن تو میں بہت خوش تھا جب منتری جی نے مجھے اپنے ساتھ ودیش چلنے کو کہا۔ سوٹ اور ٹائی میں مجھے پہلے تو منتری جی بھی نہیں پہچان سکے۔ زندگی کا مزا یورپ کے ان دس دنوں کے دورے پر آیا۔ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں رہائش، بڑے بڑے شاپنگ سینٹر سے خریداری، طرح طرح کا کھانا...... لہٰذا جب میں گھر واپس آیا تو میرا حلیہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے اور میرے منہ سے ان ملکوں کی ترقی کی داستان سن کر وہ اپنے مسئلے بھی جیسے بھول گئے ہوں۔ اور میں شرمندہ ہونے سے بچ گیا۔ مگر گاؤں کے لئے اب تک کچھ نہ کئے جانے پر میں خود ہی نادم تھا۔

اس سے پہلے کہ منتری جی سے اس بارے میں کچھ بات کرتا، پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہو گیا اور منتری جی وہاں کے سوالوں جوابوں میں کھو گئے۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا، یہاں تک کہ پانچ سال پورے ہونے کو آئے۔ میں گاؤں والوں کا سامنا کیسے کر پاؤں گا؟ ان کے سوالوں کا کیا جواب دوں گا؟ اب کس منہ سے ووٹ مانگ سکتا ہوں ان لوگوں سے۔ یہی سب سوال مجھے گھیرے ہوئے تھا اور میں ان

کا جواب لینے منتری جی کے پاس آ گیا۔ پانچ سال کے لمبے عرصے میں گاؤں والوں کے لئے کچھ نہ کئے جانے پر میں نے خوب کھری کھری سنائی اور کہہ دیا کہ اب میں ان کے لئے ووٹ مانگنے گاؤں والوں کے پاس نہیں جا سکتا۔ آخر کون سا منہ لے کر وہاں جاؤں اور کیا کہوں ان لوگوں سے؟

منتری جی میری بات سن کر مسکراتے رہے اور پھر یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ میں گاؤں جاؤں اور الیکشن کا کام شروع کروں۔ عجیب سی الجھن، مایوسی اور نراشا لئے میں گاؤں کی اور چل پڑا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب گاؤں والوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میرے کام کو سراہا۔ مجھے خود بھی تعجب تھا کہ یہ سب منتری جی نے کب کیا۔ جگہ جگہ سڑک بنانے کا سامان پھیلا ہوا تھا؟ مکھیا جی کے گھر کے پاس والی دالان میں اسپتال کا بورڈ لگا ہوا تھا؟ جہاں روز ایک ڈاکٹر مریضوں کو دیکھتا اور مفت میں دوا بانٹتا۔ اسکول بننے کی منظوری آ چکی تھی۔ صبح شام شہر جانے والی بس باقاعدگی سے آتی۔ کھیتی کے متعلق جانکاری دینے کے لئے شہر سے ایک آدمی آتا تھا۔ یہ سب شام کو چوپال پر مجھے پتہ چلا۔ دیر سے سہی مگر کام ہو جانے پر گاؤں والوں کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ میرا کام اب بہت آسان تھا۔ میں نے ان کو اور کئی خواب دکھائے اور ان سے وعدہ لیا کہ آنے والے الیکشن میں رام پرساد جی کو جتا کر گاؤں کی مزید ترقی کو پکا کریں۔

اس بار الیکشن کافی مشکل تھا کیونکہ غریبی بے روزگاری اور بجلی پانی جیسے گھسے پٹے مدوں کے بجائے اس بار نئے مسئلے سامنے تھے۔ بھائی چارے کے جذبے کو جڑ سے اکھاڑ کر انگریزوں کی ''بانٹو اور حکومت کرو'' (divide & rule) کی تھیوری کو اپنایا گیا تھا۔ ذات پات، مسجد اور مندر جیسے معاملوں کو شہ دے کر ووٹ بٹورنے کی تھیوری اپنائی گئی۔ پانی اور بجلی جیسی ضرورتوں کو بھلا کر ''عالمیت'' (Globalization) اور ''شخصی ملکیت'' (Privatization) جیسے تصورات کو اپنایا گیا تھا۔ عام ووٹر اپنے اپنے مسائل میں الجھا، تیز لہر کے بہاؤ میں بہہ گیا۔ یہاں تک کہ رام پرساد جی جیسے مہان نیتا کو اپنی سیٹ بچانے کے لئے کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ حکومت بنانے کے لئے بہت سے جائز اور ناجائز طریقے اپنائے

گئے۔رام پرساد جی اپنے حامیوں کی مدد سے حکومت میں ایک اچھے وزارتی عہدے کے دعوے دار تھے اور ان کی وجہ سے مجھے بھی سیاسی حلقوں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔

یہ نئی حکومت کیوں کہ ایک مخلوط حکومت تھی اس لئے اس میں شامل دوسری پارٹیوں کو راضی خوشی رکھنے کا کام اضافی ہوگیا۔منتری جی کے کہنے پر میں دلی میں ہی رک گیا۔ حامی پارٹیوں کی شرطیں اور اپوزیشن کی تنقید جب کچھ حد تک بے اثر ہونے لگی تو میں رام پرساد جی کے کہنے پر اپنے شہر آ گیا۔کچھ دنوں تک وہاں کا کام ٹھیک ٹھاک کر کے میں گاؤں لوٹا تو مجھے اپنی بے توجہی پر سخت افسوس ہوا۔گاؤں والوں کی شکایتوں کی لمبی فہرست میرے سامنے تھی۔سڑک بننے والا سامان خرد برد ہو چکا تھا۔بجلی کے کھمبے ادھر اُدھر پڑے اپنی کہانی سنا رہے تھے۔اسپتال کا بورڈ اڑ کر مکھیا جی کی چھت پر لٹک رہا تھا۔اسکول کی عمارت فائلوں میں ہی گم ہو چکی تھی۔ندی پر بنایا گیا پل ٹوٹ چکا تھا اور اس بار برسات میں باڑھ آنے کا خطرہ سب کے سروں پر تھا۔میں دوسرے ہی دن شہر لوٹ آیا۔ڈی۔ایم۔اور دوسرے افسروں کو ڈھیروں باتیں سنائیں۔ٹرانسفر سے لے کر معطل کرا دینے (suspension) تک کی دھمکیاں دے ڈالیں مگر وہ سب بے اثر رہیں کیوں کہ صوبے میں دوسری حکومت تھی اور ان کی پشت پناہی انہیں حاصل تھی۔بہر حال میرے چیخنے چلانے پر انہوں نے کام شروع کرنے کے لئے میرے سامنے ہی کئی فون گھما کر مجھے مطمئن کیا۔اس بار میں کام پورا کروانے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا مگر اس سے پہلے کہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا منتری جی نے مجھے ارجنٹ کام سے دلّی بلوا لیا چلو اب منتری جی سے ڈائریکٹ چیف منسٹر پر زور ڈلواؤں گا۔میں نے سوچا۔

منتری جی پارلیمنٹ میں نیا بل پیش کرنے کی تیاری میں بہت مصروف تھے۔مگر گاؤں والوں کی پریشانی کا خیال آتے ہی میں نے ان کے ذریعے کئے گئے وعدے کو دہرایا۔

''میری مصروفیت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔یہ بل پاس ہونا بہت ضروری ہے۔ گاؤں والے جیسے اب تک جیتے آ رہے ہیں کیا کچھ دن اور نہیں جی سکتے؟''ان کا لہجہ ناگوار حد تک سخت تھا۔

ہاں واقعی دیش کے مقابلے ایک چھوٹے سے گاؤں کی کیا اہمیت۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا اور ان کی مدد میں جٹ گیا۔

بل پاس ہوا تو منتری جی عام آدمی تک اپنی کامیابی کی خبر پہنچانے یاترا پر نکل گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ سیاست کی نئی نئی پیچیدگیاں میں اب سمجھ رہا تھا اور حیران ہوتا ان نیتاؤں پر جو پبلک سے ہمدردیاں جتاتے ہیں، ان کی پریشانیوں اور کٹھنائیوں میں حصے دار بننے کا دکھاوا کرتے ہیں، وعدے کرتے ہیں، طرح طرح کے خواب دکھاتے ہیں مگر ووٹ ملتے ہی سب کچھ بھلا کر کس طرح پاور ہتھیانے کے لئے مختلف سمجھوتے کرتے ہیں۔ جو خواب وہ عوام کو دکھاتے ہیں ان کی تعبیر صرف اپنے لئے ڈھونڈتے ہیں۔ کیا نام دینا چاہئے ایسے موقعہ پرست اور مفاد پرست نیتاؤں کو --- دیش سیوک؟ ملک کے خادم؟

صبح سے شام تک طرح طرح کے لوگوں کے بیچ جھولتے ہوئے میں رات کو جب اپنی ڈائری کھولتا تو میرا قلم خود بہ خود چلنے لگتا، اور صبح میں اپنے آپ کو اسی بھیڑ میں گم پاتا۔ مگر واپس لوٹنے کا حوصلہ نہیں جٹا پاتا تھا۔ میرا ضمیر ابھی زندہ تھا، اس لئے میرا قلم میرے دل کی وہ بھڑاس نکال دیتا جو میں اپنی زبان سے کہنے سے کتراتا تھا۔ کیونکہ رام پرساد جی جیسے انسان پر میرا بھروسہ تھا۔ ان کی باتوں پر یقین تھا۔ ان کی سچائی اور ایمان داری کا میں قائل تھا اور ان ہی جیسے لوگوں پر بھروسہ کرکے مجھے اس دن کا انتظار تھا جب میرے گاؤں کے ساتھ ہر گاؤں میں ترقی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ ایک نئی صبح سب کی زندگی میں ضرور آئے گی جب پانی بجلی اسکول اور اسپتال جیسی پرائمری سہولتیں سب کو میسر ہوں گی اور دیہات کے لوگ بھی قومی دھارے (National Main Stream) میں شامل ہوسکیں گے۔ ڈائری میں لکھا یہ صفحہ میں اکثر مایوسی کی حالت میں پڑھتا۔

مگر حالات کچھ ایسے بگڑے کہ تیسرے سال ہی الیکشن کی نوبت آگئی۔ اب گاؤں والوں کے سامنے میں اپنی ڈائری کا ورق لے کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ مجھے لگتا کہ میں بھی ڈائری کے اسی ورق کی طرح ہوں جسے پڑھ پڑھ کر میں خود ہی بور ہو چکا تھا۔

گاؤں کیا، اس بار شہر میں بھی ہوا رام پرساد جی کے بالکل خلاف ہوگئی تھی کیوں

کہ ان کی Globalization اور Privatization کی تھیوری کو سڑکوں اور چوراہوں پر سننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور اس کا احساس انہیں خود بھی ہو گیا تھا۔ پارٹی آفس میں ان کو ٹکٹ ملنے کے بعد بھی ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ کوئی صدا یا کوئی سلوگن ان کی حمایت کا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک عجیب سی بیزاری اور تھکاوٹ لئے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ڈائری اور قلم دونوں ہی میرے سامنے تھے مگر میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ رام پرساد جی دن بہ دن مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے خلاف نعرے اور مردہ باد کا شور ان کے حامیوں کے حوصلے پست کر دینے کے لئے کافی تھا۔

مگر پھر اچانک ہی رام پرساد جی مطمئن نظر آنے لگے۔ اپنے حامیوں کے بیچ خوش گپیوں میں مصروف...... کھنکتے ہوئے چائے کے پیالوں کا دور...... مجھے عجیب سا لگتا۔ ان کے پرائیوٹ کمرے سے میں نے کچھ نئے نئے چہروں کو نکلتے اور گھستے دیکھا...... کون ہیں یہ لوگ؟...... پر اسرار قسم کی ہستیاں...... ان جان حلیہ...... غیر مانوس چہرہ...... بولنے کا عجیب سا کھردرا انداز...... یہاں تک کہ رام پرساد جی ان کے سامنے مجھے واضح طور پر نظر انداز کرنے لگے تھے، حالانکہ ان کے اس برے وقت میں بھی میں نے ان کا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔

بینک کے سامنے بنے ڈھابے پر میں نے چائے کا پانچواں کپ خالی کیا۔ شروع مہینہ تھا، اس لئے بھیڑ بھاڑ کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اسی پر اسرار آدمی کو میں نے موٹر سائیکل کھڑی کرتے ہوئے دیکھا چلو کچھ باتیں کریں۔ میں اسے بلانے کے لئے اٹھا، مگر وہ چور نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا تیز تیز قدم بڑھاتا سڑک کے دوسرے کنارے سے ہوتا ہوا گلی میں گھس گیا۔

"عجیب آدمی ہے، پتہ نہیں کیا جلدی ہے۔" جیب سے بٹوا نکالتے ہوئے میں اپنے آپ سے بولا۔ تبھی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ملی جلی چیخیں نکلیں اور پورا ماحول اندھیرے میں ڈوب گیا۔

میں تیزی سے بھاگا۔ ستانے کے لئے ایک جگہ رکا تو چوک میں ہوئے دوسرے بم دھماکے کی خبر ملی۔ سارے شہر میں ڈر اور دہشت کا عجیب سا ماحول چھا گیا۔ اسپتال کے باہر لمبی لمبی لائنیں لگ گئیں...... اور اسی شام ہماری پارٹی کے پرانے کرتا دھرتا ورما جی کا قتل ہوگیا۔ دوسری پارٹی پر الزام تراشیوں اور پولیس کی لاپروائی کا چرچہ عام ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کا رُخ پلٹ گیا۔ ورما جی کے انتم سنسکار پر لوگوں کا ہجوم تھا اور رام پرساد جی کی جیت ایک بار پھر یقینی ہوگئی۔ دیر رات گئے پارٹی کا کام ختم کر کے میں لوٹ رہا تھا کہ یاد آیا صبح صبح ورما جی کے گھر سرودھرم پرارتھنا (مختلف مذاہب کی دعائیہ مجلس) رکھی گئی ہے جس میں رام پرساد جی کا شامل ہونا بہت ضروری ہے۔ آج کی رات وہ شہر سے باہر بنے ریسٹ ہاؤس میں آرام کی غرض سے گئے تھے۔ یہ بات میرے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھی، اس لئے تھکاوٹ کے باوجود میں ٹیکسی لے کر ان کو بتانے کے لئے چل پڑا۔

گہری اندھیری رات تھی اور عجیب سا اوبڑ کھابڑ راستہ۔ یہاں تک کہ ٹیکسی والے کے لئے جانا مشکل ہوگیا اور باقی راستہ مجھے پیدل طے کرنا پڑا۔ سامنے ریسٹ ہاؤس کی ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی تو مجھے کچھ سکون ہوا مگر اگلے ہی پل میرے پیروں کو جیسے بریک لگ گیا۔ دوسری طرف سے وہی پراسرار آدمی اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے دماغ میں عجیب سی کھلبلی مچی اور بینک کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کہیں رام پرساد جی کی زندگی کو کوئی خطرہ تو نہیں...... میں اندر ہی اندر دہل گیا۔ شکر تھا کہ میرا سرکاری ریوالور میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس پراسرار آدمی کا پیچھا کیا مگر اس سے پہلے کہ میں اس کو پکڑتا دروازہ کھلا وہ بڑی شان کے ساتھ اندر داخل ہوا اور دروازہ بند ہوگیا۔ سارے حالات مجھے عجیب سے لگے اور میں پیچھے کھڑکی تک آ گیا۔ اندر رام پرساد جی صوفے پر آرام سے بیٹھے اپنا پسندیدہ سگار پی رہے تھے۔

''اتنی صفائی سے کام کرنے والا نہیں ملے گا نیتا جی...... کوئی ثبوت کسی کے ہاتھ کبھی نہیں لگے گا۔'' وہ شان سے بولا، اور بریف کیس اٹھانے ہی والا تھا کہ میں کھڑکی سے کود کر کمرے میں آ گیا۔

''تم اس وقت کیسے آئے..... کیوں؟'' رام پرساد جی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے مارے کھڑے ہو گئے۔ مگر ریوالور میرے ہاتھ میں دیکھ کر رک گئے۔ اور ہاتھ جوڑ کر کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگے آواز میرے اندر گڈمڈ ہونے لگی..... ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے پولیس کو اطلاع دی۔ میں گرفتار ہو گیا۔ چوکیدار نے چشم دید گواہی دی۔ جج نے مجھے پھانسی کا حکم سنایا..... اور میرا بے چین دل پرسکون ہو گیا۔ رام پرساد جی جیسا سفاک قاتل اور کتنی زندگیوں سے کھیلے گا؟ مجھے لگا جیسے ورما جی کی بھٹکتی روح پرسکون ہو گئی ہو، اسپتال کے باہر لگی بھیڑ سے رونے چیخنے کی آوازیں تھم سی گئی ہو اور دادا جی نے کہیں دور سے ''جے ہند'' کہہ کر شاباشی دی ہو۔
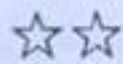
جیک پاٹ

چتا تیار تھی۔ پنڈت جی منتر پڑھتے پڑھتے تھک سے چکے تھے۔اس لیے اب خاموشی سے آنکھ موندے من ہی من کچھ پڑھتے ہوئے ہل رہے تھے۔ باقی لوگ بھی رو پیٹ کراب خاموش تھے۔ پیچھے بیٹھے لوگ کچھ زیادہ ہی اکتائے سے نظر آرہے تھے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس خاموشی کو چیرتا کوئی ہوائی جہاز ابھی آکر رکے گا اور اس میں سے سدھیر اتر کر ماں کو مکھ اگنی دے گا اور اس کی آتما ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جائے گی۔ یہی تو ایک خواہش حسرت بن کر ہر وقت اس کے ہونٹوں پر رہتی جو وہ ہر کسی کے سامنے آنسوؤں کے درمیان رکھتی۔

''بس میرا سدھو میری چتا کو اگنی دے دے تو میری آتما کو شانتی مل جائے گی۔''

''بیٹا''— ہر زمانے اور سماج کے ہر طبقے کا ٹرمپ کارڈ— کسی بھی عورت کا وہ اثاثہ جس سے وہ ذہنی...... جذباتی...... اور معاشی ہر طرح کی آسودگی کی توقع رکھتی ہے...... مرد ذات کے نام سے وابستہ مختلف رشتوں سے مسترد ہونے کے بعد وہ خوابوں کا محل بیٹے کے تصور سے ہی آباد کرتی ہے اور آنے والے وقت میں بیٹے کو اپنے ہر زخم پر مرہم رکھتے دیکھتی ہے۔''بیٹا''...... یعنی کسی بھی عورت کا جیک پاٹ خاص کر غریب، بے سہارا اور کمزور

عورت کا جیک پاٹ...... جسے وہ تجتے سنوارتے اور سنبھالتے ہوئے احتیاط کے ساتھ پال پوس کر بڑا کرتی ہے کیونکہ لفظ "ماں" کم تر سمجھی جانے والی عورت کا سب سے مضبوط اور معتبر روپ رہا ہے اور...... وہ بھی اس دیش کی ہزاروں لاکھوں عورتوں کی طرح ایک عورت تھی...... محنت کش سماج میں جنم لینے والی عورت...... ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اس نے زندگی کے سرد و گرم ہر طرح کے موسم دیکھے تھے...... مایوس بھی ہوئی تھی...... ٹوٹی بھی تھی...... ہاری بھی تھی اور لڑکھڑائی بھی تھی مگر پھر...... سنبھل گئی کیونکہ اب وہ صرف ایک عورت ہی نہیں بلکہ ایک ماں تھی۔ سدھو، گوری اور نیرو کی ماں...... سدھو کو پا کر سب اتنے خوش تھے کہ دونوں بیٹیوں کی پیدائش کو فراموش کر گئے حالانکہ بیٹے کی چاہ اور بیٹی سے نفرت ہمارے سماج کے ہر طبقے میں نسل در نسل Genes کے ساتھ منتقل ہوتی آ رہی ہے اور یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کی تیسری بیٹی پیدا ہونے کے دسویں دن مر گئی۔ سوگ منانے کی کوشش رسمی طور پر بھی نہیں کی گئی اور یوں بھی شادی سے پہلے لڑکی کی موت آج بھی آسودگی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور پھر سدھو تو تھا۔

زندگی کی راہ بھی اب اس کے لیے آسان تھی...... اپنے اکلوتے بیٹے کو پڑھانا لکھانا...... بڑا آدمی بنانا...... بڑا آدمی...... غریبی کی ریکھا کے آس پاس رہنے والوں کے لیے بڑے آدمی کا تصور کسی طلسمی دنیا جیسا نہیں بلکہ بہت عام سا ہوتا ہے...... ایک پکی چھت...... پیٹ بھر روٹی...... وہ بھی دونوں وقت...... تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا...... یعنی روٹی کپڑا اور مکان جیسی بنیادی سہولت لوور مڈل کلاس کو بڑے آدمیوں کی فہرست میں لے آتی ہے...... مگر یہاں اس کا سدھو تھا...... جو ایک الگ راہ پر چل رہا تھا...... اپنی توتلی زبان میں آسمان میں چاند تاروں کی طرح چلتے جہاز کے بارے میں سوال کرتا۔

"ماں جہاز کیسے اڑتا ہے۔"

"ماں دن میں چاند کہاں چلا جاتا ہے۔"

"ماں مجھے جہاز اڑانا سکھا دو۔"

"مجھے کیا معلوم جہاز کیسے اڑتا ہے۔ میں پڑھی لکھی تھوڑی ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے اسے چپ کرنے کی کوشش کرتی۔

''تم نے کیوں نہیں پڑھا ماں۔''

''کیونکہ ہم غریب تھے۔'' جھنجھلاتے ہوئے، بظاہر اس نے بات ختم کرنے کے لیے اسے مطمئن کر دیا۔

''ماں ہم غریب کیوں ہیں؟''

''ماں ہمارے پاس پیسہ کیوں نہیں ہے؟'' یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ منہ اندھیرے سے رات گئے تک وہ مسلسل کام کرتی رہتی ہے مگر گھر کی حالت جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے، کہیں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہی ٹوٹی دالان...... ٹپکتی چھت...... کیوں؟ اور اس کیوں کا بھلا وہ کیا جواب دے سکتی ہے...... سوائے پھوٹے نصیبوں کو کوسنے کے۔

مگر اب اس کے پاس اس کا بیٹا ہے جو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ اور اس کے مشکل کے دن دور ہو جائیں گے اس نے سامنے بیٹھے سدھو کو حسرت سے دیکھا جو اپنی کاپی پر رنگ برنگی پنسل سے کچھ بنا رہا تھا اور پھر اکثر ایسا ہی ہونے لگا۔ کام سے تھک کر جب وہ چور ہو جاتی تو اپنی تصور کی آنکھوں سے سدھو کو بڑا آدمی بنتے دیکھنے لگتی...... اونچا...... لمبا تڑنگا...... سوٹ بوٹ پہنے...... اور ایک نئی چستی اس کے ناتواں جسم میں دوڑ جاتی۔ پتا نہیں سدھو کب بڑا ہوگا...... کب وہ بڑا آدمی بنے گا...... اور کب وہ اس کے لیے ایک چاند سی بہو لائے گی...... چاند سی بہو...... اس کے دل میں عجیب سی گدگدی ہوئی اور چھم چھم کرتی ایک شبیہہ اس کی نگاہوں میں جھلملائی۔

پکّے دالان میں سلیقے سے بچھے پلنگ پر اس نے خود کو بیٹھے ہوئے دیکھا اور گھر آنگن میں اپنی چاند سی بہو کو چلتے پھرتے محسوس کیا...... کون...... رام دلاری کی لڑکی...... وہ تو اس کے بچپن کی سہیلی ہے۔ مگر نہیں کہاں میرا سدھو اور کہاں رام دلاری کی مینا اپنی ہی سوچ اسے پھیکی لگی۔ پھر بھیرو بھیا کی لڑکی...... مگر نہیں...... دن بہ دن اس کا رنگ کالا پڑتا جا رہا ہے...... ایک یہ ہے رنو...... پیدا ہوتے ہی اس کی ماں نے کہا تھا سدھو سے بیاہ کروں گی اس کا...... پڑوسن ہو...... سمدھن بننے کے بعد بدل مت جانا...... یہ بھی اچھا ہوا وہ اس وقت

کچھ نہیں بولی تھی...... میرا سدھو تو اتنا بڑا آدمی بنے گا کہ چودھری خود اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے لئے لیکر آئے گا اور میں بھی کئی پھیرے ڈلوانے کے بعد ہی ہاں کروں گی۔ وہ تصور میں اکڑی......

رام پال کو روٹی پروستے ہوئے اس کا دل بھی چاہا کہ وہ اپنی سوچ میں پتی کو شامل کرلے مگر اس کے گمبھیر لہجے نے اس کا منہ بند رکھا۔

''اس بار بھی فصل خراب جائے گی۔ بیج اچھے نہیں ملے...... ہر جگہ بے ایمانی ہی بے ایمانی ہے...... اور اوپر والا...... وہ بھی کنجوس ہوتا جارہا ہے۔ دو چار دن بارش نہ ہوئی تو......''

ہاتھ دھوتے ہوئے رام پال نے ایک نگاہ آسمان پر ڈالی اور آنگن میں بچھی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

''تو''...... ایک چھوٹے سے لفظ نے اپنے اندر کتنے معنی سمیٹ رکھے تھے اور ہر معنی ایک ڈراؤنے مستقبل کا پیش خیمہ تھا۔ تو کیا اس کے لیے خواب دیکھنا بھی گناہ ہے سدھو کو لے کر اس کے سارے سپنے ایسے ہی ادھورے رہ جائیں گے جیسے اب تک اس کی ہر آس ٹوٹتی آئی ہے۔

نہیں...... نہیں خوف کے مارے اس کو جھرجھری سی آگئی۔ سدھو کو وہ بہت بڑا آدمی بنائے گی۔ پچھلے برس ہی اسکول کے ماسٹر جی نے چھ ماہی امتحان کے بعد اس کو ایک درجہ آگے بڑھا دیا تھا۔ وہ کھیت میں رام پال کا ہاتھ بٹائے گی۔ دونوں مل کر اور محنت کریں گے...... پھر وہ سدھو کو شہر بھیجے گی۔ بڑا آدمی بننے...... اور پھر ان سب کے باقی مسئلے خود بہ خود حل ہو جائیں گے۔

امید کا دامن تھامے وہ مشکل راستوں سے گزرتی رہی۔ گوری اور نیرو کا بیاہ ہو گیا۔ گوری پانچ مہینے کا لڑکا گود میں لیے میکے آگئی۔ نیرو کی زندگی کیا تھی دھوپ چھاؤں کا ایک کھیل جہاں دھوپ کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی...... شاید اس کی طرح...... یا پھر بہت ساری عورتوں کی طرح...... اسے دیکھ کر وہ کچھ قیاس نہیں کرپاتی تھی یا پھر کرنا نہیں چاہتی تھی...... سدھو کی پڑھائی میں اس نے اپنی سب جمع پونجی ختم کر دی اور وہ انجینئر بن گیا اور پھر

جس دن وہ نوکری سے لگا اس کے سب ارمان اور سپنے پورے ہو گئے۔اوپر والے نے اس کی سن لی تھی۔آج وہ سال بھر بعد واپس آرہا تھا۔اس کی شکل دیکھنے کو ترس گئی تھی مگر بڑا آدمی بننا کوئی آسان تھوڑے ہی ہے۔یہی سوچ کر خود کو تسلی دیتی رہی۔

گوری صبح ہی کھیت سے تازہ سبزیاں توڑ کر لائی۔کتنی پسند ہے اسے ہری سبزیوں کی بھجیا، گھی لگی روٹی کے ساتھ، پتا نہیں پردیس میں کیسی روکھی سوکھی کھاتا ہوگا۔

''کتنی دور ہے بس اسٹینڈ سے یہ جگہ...... اوپر سے کسی سواری کا کوئی انتظام اب تک نہیں۔میں تو تھک گیا۔'' پسینہ میں ڈوبا وہ آتے ہی لیٹ گیا۔

''تھک گیا...... پہلے تو صبح سے شام تک وہاں کے کئی چکر لگا لیتا تھا۔'' اسے فکر ہوئی اور وہ جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی۔

گول چہرہ، کالے چمک دار بال...... چوڑی چھاتی...... موٹی موٹی انگلیوں پر گھنے بال...... کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے بیٹے کو۔وہ توے پر لال مرچ جلا کر اس کی نظر اتارنے لگی۔

''بیٹا! منہ ہاتھ دھو لے، میں روٹی ڈالتی ہوں۔تیری پسند کی بھجیا بنائی ہے۔'' بچپن میں وہ ایسے ہی بلاتی تھی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر فوراً آ جاتا مگر ایک دو تین، اس نے چوتھی روٹی توے پر ڈالی اور ایک بار پھر اسے آواز دی۔

''آ جا بیٹا روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

اس آواز اور لہجے سے وہ اتنا مانوس تھا کہ جب بھی باہر سے کمرے میں گھستا یہ آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی اور لمحوں میں وہ خود کو ماں کے قریب پاتا مگر آج...... آج یہ آواز سن کر بھی اس کا من اٹھنے کو نہ چاہا۔پھر گوری کے بلانے پر اسے اٹھنا پڑا۔

''ٹھہر میں یہ گرم روٹی دیتی ہوں۔'' ماں نے پھولی پھولی روٹی سینکتے ہوئے کہا۔

''بس'' پلیٹ میں آدھی روٹی اب بھی موجود تھی۔

''گھی کم ہے لے اور لگا دیتی ہوں۔'' ماں نے بہلانے والے انداز میں ڈبے کے پیندے میں چمچہ ہلایا۔

''نہیں اب بھوک نہیں ہے۔'' وہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔ تیز بھوک اچانک غائب ہوگئی۔ مگر اس کی بات سے ماں کو تسلی نہیں ہوئی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سدھو دیر تک کھاتا رہے۔ سواد لے کر...... روٹی پر اور گھی لگانے کی فرمائش کرے...... اس کی بنائی بھجیا کی تعریف کرے اور ادھر اُدھر کی ڈھیروں باتیں کرے۔ شہر کی...... پڑھائی کی...... نوکری کی۔ مگر وہ اٹھ گیا تھا بغیر کھائے...... مشین کی تیزی سے چلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ رام پال نے پوچھا بھی مگر وہ روٹی پروس کر اٹھ گئی۔

تھکان کے باوجود رات دیر گئے تک سدھو کو نیند نہیں آئی۔ گھر آنے کا جوش غائب تھا اور دل ایک دم اچاٹ...... پسینہ میں شرابور میلی کچیلی ساڑی میں لپٹی ماں بہت ہی عجیب ہستی لگی۔ ابھری ہوئی پسلیوں اور پچکے پیٹ کے ساتھ بابو جی اپنی عمر سے دوگنی عمر کے لگے...... گھر بھی کتنا پست اور تاریک لگا۔ جگہ جگہ سے اکھڑی مٹی اور گرتا ہوا چھپر...... نئے سرے سے بنوانے کے لیے کافی پیسہ چاہیے۔ اس نے دل ہی دل میں حساب جوڑا...... نگاہ بیگ پر ڈالی...... جہاں نشا کی تصویر رکھی تھی۔ مجھے نشا کے پاپا کا آفر قبول کر لینا چاہیے۔ Easy money کا اس سے آسان اور بہترین راستہ اس کے لیے کوئی نہیں ہوسکتا۔ دل اور دماغ دونوں ایک ساتھ راضی ہوگئے۔ بڑی جگہ پر خود کو Establish کرنے کے لیے ایک God father کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تو اتنے Resourceful ہیں کہ میرے تمام مسئلے چٹکیوں میں حل ہو جائیں گے۔ پل بھر میں چھپر اور ٹین کی جگہ پکے مکان نے لے لی۔ بنیادی ضرورتوں سے لیس گھر میں گھستے ہوئے ایک عجیب سی خوشگواری کا احساس ہوا۔ ماں بابو جی کی نکھری صورت اور گوری کی کھنکتی ہنسی نے چاروں طرف اجالا بکھیر دیا۔ نشا...... اپنے سارے مسائل کا حل اسے نشا کی صورت میں سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ اس نے نشا کے پاپا سے بات کی...... پروفیسر بخشی انہیں سدھیر کے بارے میں پہلے ہی بتا چکے تھے۔

''ذہانت...... لگن اور ایمانداری یہ تینوں چیزیں اس لڑکے کے پاس ہیں کمی ہے تو صرف Backing کی۔ تم ہاتھ رکھ دو تو نشا بٹیا راج کرے گی راج۔'' سدھیر سے پہلی ہی

ملاقات پر نشا کے پاپا پروفیسر بخشی کی باتوں کے قائل ہو گئے تھے شادی کے بعد وہ سدھیر کو اعلیٰ تعلیم (Higher Studies) کے بہانے یورپ بھیج دیں گے اور ایک بار وہاں رہنے کے بعد وہ خود ہی واپس آنا نہیں چاہے گا۔ غریب گھر کا لڑکا ہے۔ ایک دو لاکھ اس کے گھر والوں کے لیے کافی ہوگا۔ بیٹی کا Safe & Secure Future ان کے سامنے تھا۔

چاند جیسی بہو کا جو تصور سدھیر کی ماں نے کیا تھا نشا تو اس سے بڑھ کر تھی...... کتنی ہی دیر وہ ٹکٹکی باندھے دونوں کو دیکھتی رہی۔ رام سیتا کی جوڑی ہے...... صاف ستھرے سجے سجائے فلیٹ میں دنیا بھر کا سامان تھا۔ کمرہ ٹھنڈا کرنے والی مشین سے لے کر کھانا ٹھنڈا رکھنے والی مشین تک...... ہر چیز اور سب کی سب بجلی سے چلنے والی...... اس نے دور سے ہی ان چیزوں کو دیکھا۔ کہیں بجلی کا جھٹکا ہی نہ لگ جائے۔ گاؤں میں نئی نئی بجلی آئی تھی اسے یاد آیا۔ سدھو کے چاچا نے تار کھینچ کر ایک بلب لگوالیا تھا اور چاروں اور دن کا سا اجالا پھیل گیا تھا۔ مگر اس دن...... باپ رے! برسات میں ٹین ٹپکنے لگی۔ پلاسٹک بچھانے کے لیے اس نے ٹین پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ جھٹکا لگا...... وہ دور جا کے گری۔ کتنی دیر بے ہوش رہی۔ بھوت اور چڑیل کی مار اس نے سن رکھی تھی مگر اس بجلی کا جھٹکا...... توبہ توبہ...... اس نے کان پکڑ لیے۔ اندھیرے میں رہ لے گی مگر بجلی نہیں لگوائے گی اور تب سے آج کا دن...... اس نے بجلی نہیں لگوائی۔ مگر یہاں...... کچھ بھی چھونے سے پہلے اسے وہ جھٹکا یاد آجاتا اور وہ اپنا ہاتھ آنچل میں چھپائے رہی...... پتا نہیں یہ سارا سامان سدھیر نے خریدا ہے یا پھر نشا کے باپ نے دیا تھا...... مگر وہ کس سے پوچھتی...... سدھو تو ہر وقت اپنے سسرالی رشتہ داروں میں گھرا رہتا۔ "بہت بڑا کنبہ دکھتا ہے"...... رام پال نے کہا تھا۔ نشا کی ماں چمکدار ساڑی پہنے...... گہنوں میں لدی...... چھوٹے چھوٹے سے بال...... ہر وقت مردوں میں گھسی قہقہے لگاتی رہتی ہے، ذرا بھی تو لاج شرم نہیں ہے...... پتا نہیں گھرداری کب کرتی ہے...... اور اس کا باپ سوٹ بوٹ پہنے جب بھی سمدھن کے سامنے آتا وہ گھبراہٹ کے مارے گھونگھٹ نکال لیتی۔

"ارے بھئی اب تو ہم میں رشتہ داری ہوگئی ہے۔ آپ بلاوجہ پردہ کرتی ہیں۔" شادی کے دوسرے دن انہوں نے اس کے پاس کرسی کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ ڈر کے مارے

اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔

رشتہ داری تو برابر والوں کی ہوتی ہے۔ مگر وہ اور رام پال دونوں چپ رہے۔ میز پر یہاں سے وہاں تک کھانا اور برتن لگے تھے۔ کیا چیز کیسے کھائیں ہمیں تو یہ تک نہیں معلوم۔

''بھوک نہیں ہے طبیعت کچھ خراب لگتی ہے۔'' انہوں نے دور سے ہی کہہ دیا۔ وہ تو بھلا ہو بہو کا جو کھیر کا ڈونگا لے کر آ گئی۔

''ماں...... بابو جی...... آپ لوگ یہ کھیر کھائیں......''

سبھاؤ تو بہو کا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''مگر ہمارا سدھو تو بہت بھولا ہے...... اس کے ناز نخرے اٹھانے میں ہی دوہرا ہو جائے گا۔'' رام پال نے کہہ ہی دیا۔ اس نے بھی پہلی بار اس کی باتوں سے اختلاف نہیں کیا۔

دو دن میں ہی بند کمروں کی گھٹن سے ان کا جی اکتا گیا۔ ''یہاں کے پیڑ پودے بھی الگ ہیں۔'' ان ڈور پلانٹ کے پتے چھوتے ہوئے وہ رام پال سے بولی اور سب کے روکنے کے باوجود وہ تیسرے دن لوٹ آئے۔ دل پر عجیب سا بوجھ لیے۔ جیسے وہ شہر کی چکا چوند میں وہ اپنی بہت ہی قیمتی چیز بھول آئے ہوں۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا...... کھلا آنگن...... کھیت کھلیان...... کونے پر بندھی بھینس...... وہ سب کچھ ایسے دیکھ اور چھو رہی تھی جیسے بہت دنوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ عجیب سی ایک تھکاوٹ اور کمزوری وہ اپنے اندر محسوس کرنے لگی۔ گھر میں سدھو کا ذکر بھی اب کم سے کم ہوتا تھا...... اور اس دن وہ نشا کے ساتھ آ گیا۔ کتنی تمنا تھی بہو کو گھر آنگن میں دیکھنے کی پھر پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلنے کی۔ صبح ہی اس نے گوری کے ساتھ گھر کی صاف صفائی اور لیپا پوتی کی تھی۔ مگر ان کے آتے ہی سب کچھ بھدا اور غلیظ لگنے لگا۔ گھر...... چھپر...... زمین...... بچے...... برتن...... چوکا...... خوشبو میں نہائی صاف ستھری بہو کا کسی سے کوئی تال میل نہیں تھا اور وہ خود کو ننگا ہوتے محسوس کر رہی تھی اور اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے وہ سر پکڑ کر لیٹ گئی۔

''ماں جی یہ گولی کھا لیں سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔'' نشا نے گولی بڑھائی جو اس نے جلدی سے تھام لی۔ جی میں آیا اسے پاس بٹھا کر ڈھیروں باتیں کرے دل میں چھپا اپنا

سارا غبار اس کے سامنے نکال دے۔ بارہ سال کی عمر سے ڈھورہی بوجھ کو بہو کے کندھے پر ڈال کر ہر فکر اور ہر غم سے آزاد ہو جائے...... اسے ایسی دواؤں کی کیا ضرورت...... اس کا درد تو یوں ہی چھومنتر ہو جاتا...... اس نے گولی آنچل میں لپیٹی۔ اس سے پہلے صرف ایک بار انگریزی دوائی کھائی تھی...... الٹی اور جلن کے مارے بری حالت ہو گئی تھی۔

''پتا نہیں بہو آج رکے گی یا پھر چلی جائے گی۔'' ایک دوسرا خیال سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے سر کا درد اور بڑھنے لگا۔

سدھو کو بیگ اٹھائے آتا دیکھ کر اسے سکون ہوا۔

''رکو گے نہیں بیٹا'' یہ کہنا شاید ضروری تھا۔

''یہاں کا حال تو تمہارے سامنے ہے ماں...... ایسے میں......'' اس کی ہچکچاہٹ وہ سمجھ رہی تھی۔ گاڑی جیسے ہی موڑ کاٹ کر نکلی ایسا لگا سب کو قید سے رہائی مل گئی ہو۔

''چلی گئی بہو'' ٹوٹی دیوار سے جھانکتی رام بیری نے سر نکال کر پوچھا۔

''کتنی اچھی میم جیسی بہو ہے تمہاری۔'' اس کے ساتھ کھڑی لکشمی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''ہاں...... بہت اچھی ہے۔ مجھے زبردستی اپنے ساتھ شہر لے جا رہی تھی۔ پر میں نے منع کر دیا...... اب یہ گرہستی بھلا چھوٹنے والی ہے۔ تم بھیتر کیوں نہیں آئیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''تم نے بلایا ہی نہیں۔ بہو کو دیکھ کر پڑوسیوں کو بھول گئیں۔'' گوری کی آواز آئی۔

''ارے بھاگوان پہلے میری بنڈی تو اتار...... کوری بنڈی شریر سے چپک۔ کر رہ گئی ہے۔'' رام پال کی آواز آئی۔

''یہ برسات نکلنی مشکل لگتی ہے۔ کیوں سدھو کی ماں......'' رام پال نے پہلی ہی برسات پر ٹپکتی چھت دیکھ کر کہا۔

''ہاں'' وہ فقط چھت دیکھتی رہ گئی۔ زمین تو مٹی ڈال کر لیپ پوت کر وہ برابر کر لیتی مگر چھت تک اس کی پہنچ آسان نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں چھت دیکھتے ہوئے اسے

سدھو کی یاد آ گئی۔سدھو بھی تو اسی چھت کی طرح ہو گیا ہے وہ اپنا ہاتھ پھیلاتی ہے مگر وہ چھوٹا ہی پڑتا ہے۔

''سدھو نے کچھ کہا؟'' اسے چپ دیکھ کر رام پال پھر بولا۔

'' کچھ گھنٹوں کے لیے تو آیا تھا کیا کہتا۔'' اسے غصہ آ گیا۔

''ہوں'' پتا نہیں اس ہوں کا کیا مطلب تھا، وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

گوری کا لڑکا بڑا ہو رہا تھا وہ ماں سے طرح طرح کے سوالات کرتا اور وہ ہنس ہنس کر اس کا جواب دیتی...... پتا نہیں کیوں یہ سب اسے بہت کھوکھلا اور بے جان لگتا۔

اس دن اچانک سدھو آ گیا۔اکیلا ہی آیا تھا اس لیے اسے گھر اور اپنے آپ سے کوئی کوفت نہیں ہوئی۔گوری اسے دیکھتے ہی تازی ساگ سبزیاں لینے جانے لگی۔

''بس رہنے دو ماں...... میں نے راستے میں کھا لیا تھا۔'' وہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کھا لیا تھا'' اسے عجیب سا لگا۔گوری کے بڑھتے قدم رک گئے۔وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ولایت جانے کی بات...... گھر بنوانے کی بات۔

''ماں یہاں کی نوکری میں اپنا گزارا مشکل ہے...... تو کسی اور کا کیا ہو سکتا ہے اس لیے باہر جانا ضروری ہے...... گھر کی حالت مجھ سے چھپی نہیں ہے۔''

یہ اپنا کون اور پرایا کون...... اس کا دماغ ٹھنکا۔حالانکہ اب تک وہ صرف جسمانی محنت کرتی آئی تھی۔دماغ کا استعمال کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

''بہو کو نہیں لائے۔'' اپنا سوال اسے ہی بہت غیر ضروری لگا۔سدھو نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''بابو جی نہیں آئے اب تک۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔

''وہ تو شام گئے ہی آتے ہیں۔کھیتی باڑی میں رکھا ہی کیا ہے صرف محنت اور دو جون کی روٹی...... پہلے دودھ دہی کا سہارا تھا مگر اب بھینس بھی دودھ دینے کے قابل نہیں رہی۔''

''اس کو تو بیکار ہی باندھ رکھا ہے۔ کسی کام کی نہیں۔ گھر میں گندگی اور بدبو الگ.....'' وہ بلاوجہ طیش میں آ گیا۔

''ارے زندگی انہیں جانوروں کے سہارے گزری ہے۔ دودھ دہی کھایا ہے ان کا.....اب کام کی نہیں رہیں تو قصائی کو بیچ دیں یا پھر گلیوں میں چھوڑ دیں۔'' وہ تلخ ہو گئی۔

''سدھو کی ماں!'' پتا نہیں کب رام پال اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سدھو چلا گیا۔ وہ دیر تک باہری دروازے پر کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی.....دور..... اور دور ..... بہت دور..... اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پورے دن کا چاند اندھیری رات میں چمک رہا تھا۔ سدھو بھی اسے چاند ہی لگا۔ وہ اسے محسوس تو کر سکتی ہے لیکن چھو سکتی ہے اور نہ ہی پا سکتی ہے۔ چاند تاروں کی بات اپنی توتلی زبان میں کرنے والا اس کا سدھو خود اس کے لیے ایک تارا بن گیا اور بہت دور چلا گیا۔ دھیرے دھیرے بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ ٹوٹے دالان اور کھپریل کی جگہ کمرے بن گئے۔ آنگن پکا ہو گیا۔ سامنے ایک نل لگ گیا۔ رسوئی الگ بن گئی۔ اس کی نانا کے باوجود بجلی بھی آ گئی اور کمروں میں پنکھے لگ گئے۔ گاؤں میں ٹیلی فون کی لائن آئی تو چودھری سے کہہ کر سدھو نے فون لگوا دیا۔ مہینے میں ایک دوبار اس میں سے سدھو کی آواز آتی اور باقی دن وہ ٹیلی فون کے تاروں کو چھو کر سدھو کا لمس پانے کی کوشش کرتی۔ وہ بے جان تار سدھو کی آواز تو اس تک پہنچا دیتے تھے مگر اس کے احساس کو کہاں چھو پاتے تھے۔ دو چار رسمی جملے.....مگر وہ تو ماں ہے۔ بھلا ان تاروں سے وہ کیسے سمجھوتہ کر سکتی ہے۔ اسے تو اپنا رشتہ نبھانا ہی ہے اور تعلق کی اسی ڈور کو سنبھالتے ہوئے اس کی ایک آخری خواہش ایک حسرت بن کر ہر وقت اس کے ہونٹوں پر رہتی۔

''مجھے اب کچھ نہیں چاہئے بھگوان سے۔ بس میرا بیٹا مجھے اگنی دے دے تو میری آتما کو شانتی مل جائے'' اور آج اس کا جیک پاٹ کھلنے کا دن آ گیا تھا۔

''چاچا!..... چاچا! سدھو بھیا کا فون آیا ہے چودھری چاچا کے پاس۔'' رام پال کا بھتیجہ برکھو دوڑتا ہوا آیا اور سب مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

☆☆
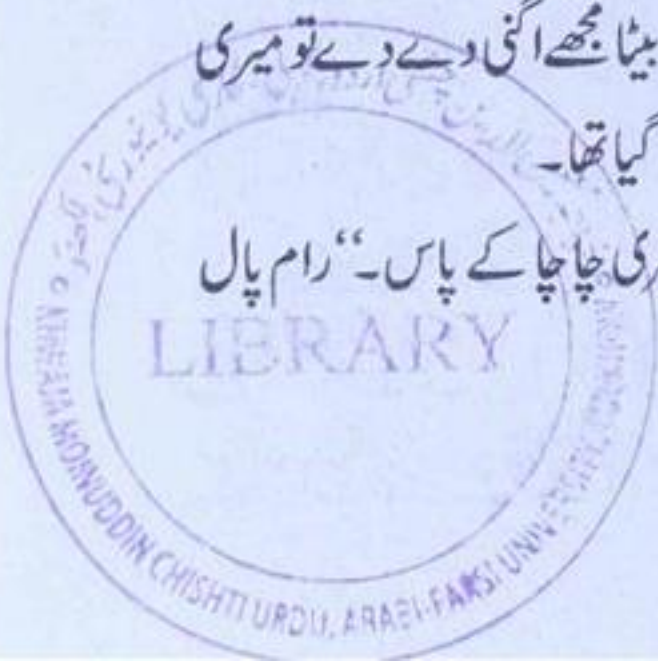
زلزلہ آگیا

’’امی یہ کیا ہے؟‘‘ ٹی وی پر چاروں طرف ملبہ دیکھ کر میری متجسس اور حساس بیٹی ثنا نے میرے پاس آتے ہوئے پوچھا۔

’’بیٹے یہ بھج کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور...... کل یہاں زبردست زلزلہ آیا ہے۔‘‘

’’زلزلہ...... یہ کیا ہوتا ہے امّی‘‘ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

’’بیٹا زلزلہ سے زمین پھٹ جاتی ہے اور وہاں موجود ہر چیز زمین میں دھنس جاتی ہے اور......‘‘

’’اور وہاں کے رہنے والے؟‘‘ اس نے بیچ میں ہی روک کر پوچھا۔

’’وہ بھی ملبے میں دب جاتے ہیں...... پھر ملبہ ہٹاتے ہیں اور...... اور یہ دیکھو......‘‘ میں نے اسکرین کی طرف دکھاتے ہوئے اسے بتایا ’’۲۶ رجنوری کی وہ صبح گجرات کے لوگوں کے لئے موت کا پیغام لے کر آئی تھی۔ زلزلہ کے لرزہ خیز مناظر دل دہلا دینے والے تھے...... رات تک جہاں زندگی تھی...... ہنگامہ تھا...... صبح وہاں ویرانی پھیل گئی تھی اور زندگی کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک قیامت تھی جو خاموشی کے ساتھ آکر گزر گئی تھی اور

اپنے ساتھ پتہ نہیں کتنی چیخیں اور آہیں دبالے گئی تھی...... ہمارے آس پاس یعنی احمد آباد میں بھی زلزلہ کے جھٹکے محسوس کیئے گئے تھے۔ کچھ عمارتوں میں دراڑیں بھی آئی اور کہیں کہیں مالی نقصان بھی ہوا تھا مگر کل ملا کر صورت حال قابو میں تھی اور ہم سب خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ٹی وی پر نظر جمائے ہوئے تھے۔

کچھ دنوں تک یہ خبر ہر طرف چھائی رہی۔ اخبار اور ٹی وی پر زلزلہ کے متعلق نئے نئے انکشافات ہوتے رہے اور جانی و مالی نقصانات کی فہرست لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی...... رفیوجی کیمپ کھولے گئے...... فلاح و بہبود اور باز آبادکاری کے کام شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے زلزلہ میں ہوئی تباہی کے بجائے بدعنوانی اور ناانصافی سرخیوں کا مرکز بن گئی...... دن گزرے...... موسم بدلے...... اور پھر کلینڈر بدل گیا۔ گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس میں لگی آگ کے ردعمل میں پورا گجرات اور خاص طور پر احمد آباد جل اٹھا۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا وہاں کی تباہی اور بربادی کے کوریج میں ایک بار پھر جڑ گئے۔ اس بار پھر انسانی جانیں گئی تھیں...... بزنس تباہ ہوا تھا۔ ہزاروں افراد بے گھر ہو گئے تھے۔ تباہی اور بربادی کی داستان وہی تھی مگر پیرائے بدل گئے تھے...... یہ حادثہ نہیں بلکہ حکمت عملی تھی۔ قدرت نے مرنے والوں میں امتیاز نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی امدادی کاموں میں لاپرواہی برتی گئی تھی...... مگر آج کی کہانی دوسری تھی...... یہ مذہبی رنگ میں رنگے جنون اور حیوانیت کی داستان تھی...... پہلے اپنے عزیزوں کے بچھڑنے کا غم تھا مگر بچ جانے والوں کی آنکھوں میں تشکر اور سکون کے لمحات بھی تھے...... درد و کرب کا بیان تھا مگر آنے والے وقت سے امیدیں تھیں...... لیکن آج نہ تو امید تھی، نہ تشکر اور نہ ہی سکون کے لمحات...... بس ایک خاموشی تھی...... مایوسی اور بے بسی کا لبادہ اوڑھے...... ڈر اور دہشت کی تصویر میں...... جو اس وقت رفیوجی کیمپ میں رہنے والی ہر آنکھ سے عیاں تھی...... رفیوجی کیمپ...... اپنے ہی گھر...... محلے اور شہر سے خائف ہو کر...... بے سروسامانی کی حالت میں رفیوجی کیمپ میں پناہ لینے والوں کی داستان ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی...... ان کے چہروں پر لکھی تھی اور ان کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں پنہاں تھی...... ان کے لہجوں میں انجانا کرب اور دلوں میں ڈر بسا تھا...... ڈر

جو ختم ہو گیا اس کا نہیں...... جو لٹ گیا اس کا بھی نہیں...... اور جو جل گیا اس کا بھی نہیں......
ڈر تھا تو آنے والے لمحوں سے...... اس جنون سے...... جس نے انسان کو درندوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا اور امید کے دیے ان آنکھوں میں ہی بجھا دیئے تھے۔ جس نے زندگی کو مشکل اور موت کو بے حد آسان بنا دیا تھا...... کیمپ کے ایک کونے میں نو دس سالہ وہ بچی خاموش بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی...... آنسوؤں کی ایک لمبی دھار اس کے گالوں پر نشان چھوڑ چکی تھی...... اور اب اس کی آنکھیں بالکل خشک اور پتھرائی سی تھیں۔

''چاکلیٹ''...... میں نے پرس کھول کر پیکٹ سامنے لہرایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جنبش ہوئی...... ہونٹ بھی کپکپائے مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر کسی پتھر کی طرح ساکت ہو گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا مگر وہ اب بھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔

''اور کون ہے یہاں تمہارے ساتھ'' میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ ویسے ہی خاموش رہی...... ساکت و جامد...... مجھے اس کی آنکھیں خوفناک حد تک پھٹی معلوم ہوئیں۔

''پتہ نہیں کون ہے بیچاری...... کچھ بولتی ہی نہیں...... اور نہ ہی کھاتی ہے۔ پانی تک مشکل سے پیتی ہے۔'' پاس سے کسی کی آواز آئی بھولی سی بچی اپنے اندر ایک عجیب سی مقناطیسی کشش لئے ہوئے تھی اور میں کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت میرے سامنے ایک بچی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ تباہی اور بربادی کی پوری داستان تھی۔ اس کے سوکھے ہوئے آنسوؤں کی دھار میں اس کی چیخیں پوشیدہ تھیں...... اس کے کپکپاتے ہونٹوں میں آہیں دبی ہوئی تھیں اور اس کی ان پھٹی پھٹی آنکھوں میں معلوم نہیں کتنی کہانیاں چھپی تھیں...... میں بظاہر اپنے گروپ کے ساتھ کیمپ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہی تھی مگر میرا خیال مستقل اس کی طرف لگا رہا۔

''تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔'' تین چار گھنٹے کے بعد میں پھر واپس اس کے پاس

آئی اور دوستانہ لہجے میں اسے پکارا۔ پتہ نہیں یہ میرا وہم تھا یا پھر خوش فہمی مجھے اس کی آنکھوں میں ایک چمک محسوس ہوئی۔ اور میں نے لمحوں میں فیصلہ کرلیا کہ میں اس بچی کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔

''تم میرے ساتھ چلو۔''اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ افراتفری اور بے ترتیبی کے باعث کسی نے ہماری طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور میں اسے لے کر باہر آ گئی۔

کئی دن گزر گئے...... میرا خیال تھا وہ دھیرے دھیرے معمول پر آجائے گی اور اپنے بارے میں بتائے گی، مگر اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے اور طور طریقوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اچھے گھر کی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بولنے سے مجبور ہو...... مجھے ایک دم خیال آیا اور میں کاغذ قلم لے کر اس کے پاس آ گئی۔

''اپنا نام لکھو''میں نے پین اس کے ہاتھ میں دے کر نختی سے کہا۔

مختلف طریقوں سے اس سے پوچھا مگر اس نے کچھ نہیں لکھا اور نا ہی کچھ بولی۔ بس خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''تم کچھ بولو گی نہیں اور بتاؤ گی نہیں تو اپنے گھر کبھی نہیں جاسکو گی...... بولو...... کچھ تو بولو......''میں نے اسے ہلایا مگر وہ پھر بھی خاموش رہی...... میں نے اپنی سائیکیٹرسٹ دوست سے مشورہ کیا۔ مگر اسے بھی کوئی کامیابی نہیں ملی۔ کئی مہینے گزر گئے میں اسے اسکول لے کر گئی۔ ہم عمر بچوں کے بیچ چھوڑا...... مگر اس کی حالت ویسی ہی رہی...... کھوئی کھوئی سی چاروں اور دیکھتی رہتی...... اور پھر سب سے الگ جا کر بیٹھ جاتی۔ وقت گزرتا گیا۔ مگر اس کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا...... دماغی طور پر وہ بالکل نارمل تھی...... مگر شاک کی کیفیت نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔ وقت کے ساتھ وہ ٹھیک ہوجائے گی Neurologist کا خیال تھا۔ مگر کب؟...... میری قوت برداشت جواب دینے لگی تھی اور میں اپنے طور پر اس کو نارمل رکھنے کی کوشش میں لگی رہی۔

اس دن جب میں بچوں کو ٹیوشن دے رہی تھی...... روز کی طرح وہ میرے سامنے

بیٹھی تھی اور کھڑکی کے باہر کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ دیر تک دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔

''میڈم زلزلہ کیسے آتا ہے؟'' ایک بچے نے جغرافیہ کی کتاب کھولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''بیٹا زلزلہ سے زمین پھٹ جاتی ہے اور وہاں موجود ہر چیز زمین میں دھنس جاتی ہے اور تہس نہس ہو جاتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف ملبہ پھیل جاتا ہے اور تباہی و بربادی......''

''جھوٹ...... جھوٹ...... امی جھوٹ کہتی تھیں اور اب آپ بھی جھوٹ بول رہی ہیں۔'' وہ ہسٹیریائی کیفیت میں چلائی اور ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''زلزلہ آتا ہے...... میں نے دیکھا ہے زلزلہ...... مگر وہ ایسے نہیں آتا جیسے امّی نے کہا تھا اور اب آپ کہہ رہی ہیں...... زلزلہ سے زمین نہیں پھٹتی...... کچھ نہیں دبتا...... بلکہ بہت سارے لوگ آتے ہیں، شور مچاتے ہوئے...... نعرہ لگاتے ہوئے...... ہاتھوں میں تلوار اور بندوق لئے ہوئے...... اور پھر وہ گھروں پر پٹرول ڈالتے ہیں...... اور آگ لگا دیتے ہیں۔ سب چیختے ہیں...... چلاتے ہیں...... امی...... ابو...... بھیا...... مگر سب جل جاتے ہیں...... سب...... میں نے دیکھا تھا زلزلہ...... ہاں میں نے...... صرف میں نے...... کیونکہ اور سب تو جل گئے......''

چیختے چیختے وہ گر کر شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ سارے بچے بھی بالکل بے حس و حرکت خاموش کھڑے تھے...... کوئی اسے آواز نہیں دے رہا تھا۔ شاید میری طرح ان سب کو بھی یہ خوف تھا کہ جغرافیہ کی کتاب میں لکھے زلزلہ کے مضمون کیلئے یہ تبدیلی کیا رنگ لائے گی۔

☆☆

بند کمرہ

''دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے......اوں......ہوں......''

''واؤ بڑی خوش نظر آ رہی ہو......کیا بات ہے......سلسلہ بیٹھ گیا کیا؟''

نمرتا نے موہنی کو گنگناتے دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اشارہ کیا اور اپنا پرس پھینک کر آڑے ترچھے بیڈ پر لیٹ گئی۔

''نشہ تو تمہارے اندر بھی نظر آ رہا ہے جانی......کیا ہوا باس کے ساتھ سیٹنگ ہوئی کیا'' موہنی اس کے پاس ہی لیٹ جاتی ہے اور نمرتا کے بالوں میں لگے clutcher سے کھیلنے لگتی ہے۔

''اسٹوپڈ......ایک دم بور ہے یار......کام......کام......کام......اس کے سوا جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ ویسے آج تین بار اپنے چیمبر میں مجھے بلایا......مگر ہر بار نئے نئے کام بتا کر چلتا کیا......لائف از سو بورنگ''

اس نے برا سا منہ بنایا۔

''اچھا......تو بتا راکیش نے کچھ کہا......بات آگے بڑھی یا ابھی۔''

''وہ......تمہارے باس سے بھی گیا گزرا ہے۔ لنچ کا آفر اس وقت دیا جب ٹائم

ختم ہو رہا تھا..... اپنی قسمت میں تو بس بڑے لالہ کے سموسے اور چائے ہی ہیں.....'' اس نے لمبی سانس لی اور دونوں اداس ہو گئیں۔ پھر جوش میں آتے ہوئے نمرتا بولی۔

''کم آن..... چلو گھومنے چلتے ہیں کہیں.....''

''دور اس بستی اور یہاں کے بسنے والوں سے بہت دور.....'' اور دونوں تیار ہونا شروع کر دیتی ہیں۔

''یہ دیکھو لپ اسٹک کا یہ شیڈ.....''

''بیوٹی فل..... تم پر یہ رنگ بہت سوٹ کرے گا اور ہر کلر کے ساتھ چلے گا..... اور کیا کیا ہے۔'' موہنی اس کا پرس کھکھوڑنے لگتی ہے۔

''مائی گڈنس..... یہ تو پورا میک اَپ کٹ ہے..... میں دیکھوں۔'' اور دونوں معصوم اور نٹ کھٹ لڑکیوں کے اسٹائل میں مختلف چیزوں کا ٹرائل لیتی رہتی ہیں۔ ہنستی ہیں، خوش ہوتی ہیں اور پھر سج دھج کر نکلنے کے لیے باہر آتی ہیں۔

نمرتا موہنی سے پوچھتی ہے۔

''کہاں چلیں''

''تم بتاؤ''

''بیچ پر..... لیکن نو بجنے والے ہیں۔ چوکیدار دس سوال پوچھے گا۔''

''چلو پھر واک کر کے لوٹ آتے ہیں۔'' اور دونوں کمرہ لاک کر کے نکل پڑیں۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ یعنی کسی طرح کے سوال و جواب کا کوئی خطرہ نہیں۔

وومنس ورکنگ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۲۳ کی یہ دونوں لڑکیاں دو سال سے یہاں مقیم ہیں۔ نمرتا نے بی۔ اے کے بعد آفس مینجمنٹ کا کورس کیا تھا اور اب ایک جانی مانی فرم میں ملازم تھی۔ پہلے کسی رشتہ دار کے ساتھ تھی مگر اب یہ ہوسٹل ہی اس کا مسکن تھا۔ موہنی نے BBA کیا تھا اور سرکاری ملازم تھی۔ دونوں کے گھریلو حالات تقریباً ایک سے تھے۔ گھر کی طرف سے نہ کوئی روک ٹوک تھی اور نہ یہ امید کہ ان کا کوئی بندوبست کریں گے بلکہ گھر والوں کی گاڑی چلتی رہنے کے لیے دونوں ہی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ منی آڈر کی شکل میں روانہ

کرتیں اور بے فکر ہو جاتیں۔ مگر اپنے غیر محفوظ مستقبل سے خائف اور کچھ حالات اور عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر دونوں نے محبت کی چاشنی اپنے آس پاس ہی محسوس کر لی۔ نمرتا کے بڈھے کھوسٹ اور پائی پائی کا حساب کتاب رکھنے والے باس کے بیٹے نے آفس کا کام کاج سنبھالا۔ اس کے آتے ہی نمرتا کو اپنے دل کی دنیا آباد ہوتی نظر آنے لگی اور وہ چاند ستاروں کا سفر کرنے لگی۔ آفس میں نمرتا کے علاوہ مسز چوپڑا تھیں جو بڑھتی عمر کے ساتھ بدمزاجی میں بھی اپنا مقام بنا چکی تھیں۔ رتنا تھی مگر اس کا شکی شوہر آفس چھوڑنے اور لے جانے کے علاوہ لنچ میں بھی آدھمکتا۔ اب نمرتا ہی تھی جس کے پاس گرین سگنل کی جھنڈی تھی اور وہ مسٹر انل پاٹھک کو قابو میں کرنے کے تمام ہتھیاروں سے لیس آفس آتی۔ جس دن انل آفس میں داخل ہوتے وقت اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔ اسے چاروں طرف پھول ہی پھول کھلتے نظر آتے اس کا دل چاہتا کہ وہ کھلکھلا کر ہنسے۔ سب لوگوں کو بتائے...... وہ انل کے چیمبر کے چکر لگاتی رہتی...... جان بوجھ کر فائل میں کچھ نہ کچھ غلطی کر دیتی اور اس کے اگنور کرنے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتی۔ مگر کم بخت اس سے آگے بڑھتا ہی نہیں تھا...... نا کبھی لفٹ دی اور نا ہی لنچ کا آفر...... جب کہ اس کی پوری تنخواہ بیوٹیشن اور بوٹیک کی نظر ہو رہی تھی۔

دوسری طرف موہنی کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ راکیش اس کا کولیگ تھا...... اس کا راستہ ہوسٹل سے ہو کر گزرتا تھا...... پھر اکثر یہ ہونے لگا کہ وہ جیسے ہی ہوسٹل کے قریب آتا موہنی اس کو آفس جانے کے لیے تیار نظر آتی۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوتا۔ جھجکتے ہوئے ایک دن اس نے موہنی کو لفٹ آفر کی۔ وہ تو تیار ہی تھی۔ اس کا آفر خوشی سے قبول کیا۔ آگے راستہ صاف ہونے کی امید بڑھی...... اب یہ باقاعدہ ایک معمول بن گیا تھا۔ واپسی میں بھی وہ اسے چھوڑتا ہوا نکل جاتا۔ مگر پھر اس کو گھر تبدیل کرنا پڑا اور یہ معمول ختم ہو گیا۔

تیز میوزک کے دوران دونوں نے کھانا ختم کیا اور واپسی میں آئس کریم کھاتے ہوئے لوٹیں۔ بارہ بج چکے تھے۔ چوکیدار بڑا سا تالا لگا کر خراٹے لے رہا تھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر ایک دوسرے کے سہارے گیٹ عبور کیا اور ننگے پاؤں چوکیدار کی چارپائی کے پاس بچی تنگ جگہ سے بے آواز گزر گئیں۔ سبھی کمرے بند تھے۔ زیادہ تر لوگ شاید سو بھی

چکے تھے۔ ویسے بھی یہاں کے مکینوں کی زندگی ایک بندھے ٹکے اصول کے تحت ہی گزرتی ہے۔ مشکل سے ہی کچھ حالات ایسے میسر آتے ہیں جب Excite ہونے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ آج دونوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور اب وہاں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

پتہ نہیں صبح الارم بجا تھا یا نہیں۔ دونوں کی نیند زاہدہ کے زور زور سے کنڈی بجانے سے کھلی۔

''پرانے زمانے میں لوگ گھوڑے بیچ کر ایسی نیند سوتے تھے۔ تم لوگوں نے کیا بیچا ہے۔''

''اپنا چین'' کنڈی کھول کر دونوں نے ایک آواز میں کہا وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس لوٹ گئی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ شام کو دونوں پھر تیار تھیں۔ آفس سے لوٹتے وقت دونوں ایک مقررہ جگہ پر ملیں۔ پھر دل کھول کر شاپنگ کی۔ کپڑے جوتے پرس اور میچنگ جویلری پھر کھانا کھایا اور لوٹ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنی لائی ہوئی چیزوں کو ٹرائی کر کر کے دیکھتی رہیں اور راکیش اور مسٹر انل پاٹھک کی نظروں کو اپنے اوپر محسوس کرتی رہیں۔ پھر چوکیدار کی نظر بچا کر باہر نکل گئیں۔ بیچ (beach) پر اس سے پہلے دونوں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صرف ایک بار آئی تھیں۔ اور ''ٹھیک لگا'' کے ایمپریشن کے ساتھ لوٹ گئی تھیں...... مگر آج وہ دونوں تھیں اور چاروں طرف جھومتی گاتی نغمے بکھیرتی فضائیں ...... آنچل کو اڑاتی مدہوش کرتی ہوائیں...... زلفوں سے اٹکھیلیاں کرتا...... اور اطراف سے بیگانہ کرتا موسم...... اور پیروں کو شرابور کرتا ٹھنڈا پانی...... دونوں کی ہنسی اور قہقہے...... اونچی اونچی لہروں کے بیچ ڈوب جانے کی خواہش اور ڈوب کر پھر کبھی نا ابھرنے کی حسرت......

چوکیدار خراٹے بھر رہا تھا۔ گیٹ سے کچھ پہلے ان کی ٹیکسی رُکی اور پہلے دن کی طرح ہی وہ گیٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوئیں اور دبے پاؤں چلتے ہوئے کمرے تک آ گئیں۔ زاہدہ کو دوسرے دن پھر دروازہ پیٹ کر ان کو اٹھانا پڑا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس چوکیدار

حیران و پریشان سب کو بتا رہا تھا کہ کل رات پتہ نہیں کون گیلے جوتوں کے نشان کوری ڈور میں چھوڑ گیا جب کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ سب لاعلم تھے۔ مگر دونوں کو اپنی واحد ہاتھ آئی تفریح معدوم ہوتی نظر آ رہی تھی...... اور اچھی خاصی صبح ان کی شام کی بدرنگی کی اطلاع بن کر آئی تھی۔ بجھے دل کے ساتھ دونوں اپنے، اپنے آفس روانہ ہو گئیں۔

انل پاٹھک نے اس دن نمرتا سے کچھ خاص پروجیکٹ ڈسکس کیے۔ دیر ہونے پر لنچ بھی چیمبر میں منگوایا اور واپس لوٹتے وقت اسے ہوسٹل ڈراپ کرتے ہوئے گئے۔ گیٹ پر کھڑی نمرتا، موہنی کے انتظار میں اس کے خلوص کو تولتی رہی۔ یہ محض ہمدردی ہے یا پھر کچھ اور...... ہوں تو صاحب راستے پر آ گئے۔ آخر میں اس کے دل نے گواہی دی...... حالانکہ اس نے مالکوں کی بے حسی کے بہتیرے قصے سن رکھے تھے کہ کس طرح یہ بھولی بھالی سکریٹریوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں...... اور پھر خوشبو کی طرح اڑ جاتے ہیں اور بیچاری سکریٹری کی زندگی میں صرف بدبو رہ جاتی ہے مگر وہ ان معصوم اور بھولی بھالی سکریٹری کی طرح کلی کا کردار ادا کرنے کے بجائے ایک خوبصورت تتلی کا کردار نبھائے گی جس کو مٹھی میں لینے کی خواہش پیچھے پیچھے بھاگنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔

''ہائے نمرتا......'' موہنی نے اس کی پیٹھ پر اتنی زور سے دھپ ماری کہ وہ کلبلا اٹھی۔

''بے قابو تو مجھے ہونا چاہیے اور توں......''

''کیا ہوا''

''چلو پہلے کہیں بیٹھتے ہیں اور پھر۔''

''مگر وہ چوکیدار...... آج تو......''

''چوکیدار...... لوگ بڑے بڑے کام نکالتے ہیں اور توں...... ٹھہرو'' چٹکی بجاتے ہوئے وہ چوکیدار کی طرف بھاگی اور اس سے پتہ نہیں کیا کہا کہ وہ۔

''آپ بے فکر ہو کر جاؤ، واپسی پر گیٹ کھلا ملے گا۔'' کہتا رہا۔

''دیکھا پیسے کی طاقت...... دو دن سے بلاوجہ کو دنے کا رسک لیا۔ میرے انگوٹھے میں تو ابھی بھی درد ہے۔''

''ہائے میری جان تو انگوٹھے کے درد سے پریشان ہے۔ یہاں تو کم بخت دل ہے کہ بے قابو ہو رہا ہے۔'' نمرتا نے زبردست ایکٹنگ کی۔

''کچھ بولو بھی کیا ہوا۔''

''پہلے تم......''

''آج راکیش نے......اوہ راکیش'' اس نے ہوائی بوسہ اچھالا مگر نمرتا نے اپنی تمام تر توجہ کول ڈرنک پر مرکوز رکھی۔

''پتہ ہے نمرتا آج کیا ہوا۔''

''کچھ بتاؤ گی تو پتہ چلے گا نا مگر تم ہو کہ نہ سنتی ہو اور نہ سناتی ہو۔'' اس کی زبان پر شکوہ تھا۔

''آج راکیش نے مجھے پروپوز کیا۔'' اس نے جیسے دھماکہ کیا۔ نمرتا کرسی سے اچھل گئی۔

''مجھے بھی خود کو نارمل رکھنے میں بہت دقت آئی تھی۔''

''اچھا جلدی سے پوری بات بتاؤ۔''

''آج لنچ ٹائم میں وہ مجھے اوپن ایئر رسٹورنٹ لے گیا۔ ایک الگ تھلگ جگہ پر ہم بیٹھے۔ کھانے کے بعد اس نے میری طرف جھکتے ہوئے......''

''کیا کیا'' نمرتا بھی اس کی طرف جھکی اور اس کی اس عجلت پر موہنی ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

''کیا نہیں......کہا۔'' وہ ہنسی پر قابو پا کر بولی۔

''اس نے کہا موہنی میری ماں آنے والی ہیں۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔'' اب ہنسنے کی باری نمرتا کی تھی۔ موہنی ناراض ہو گئی۔

''اور......اور کیا کہا۔'' وہ ہنسی روک کر بولی۔ تو موہنی نے سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم سر پر آنچل ڈال کر ان کا پیر چھونا اور وہ تم کو دودھوں نہاؤ اور پوتو پھلو کا آشیرواد

دیتی گلے سے لگالیں گی، ہے.....نا۔"
"ہاں" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے معصومیت سے بولی۔نمرتا نے نا میں سر ہلایا۔
"یہ مت بھولو نمرتا کہ راکیش ایک متوسط طبقہ کا لڑکا ہے اور اس بیک گراؤنڈ کے لڑکے یونہی پروپوز کیا کرتے ہیں۔"
"جواب نہیں اس کے بیک گراؤنڈ کا، مگر تم یہ مان لو کہ تم ایک دم بدھو ہو۔"
"مجھے راکیش پر پورا بھروسہ ہے۔اس نے مجھے زندگی کے نئے معنی سمجھائے ہیں۔تم بتاؤ......"
"میں......ہاں تو انل نے مجھ سے اپنی کسی ماں واں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔بس مجھ پر یہ ظاہر کیا کہ میں اس کے لیے اہم ہوں۔اور اس کے اتنے بڑے اسٹاف کے باوجود بہت سے کام میرے بغیر ادھورے ہیں۔اب یہ میرے اوپر ہے کہ میں اس کی لائف اپنے بغیر impossible بنادوں۔ویسے یہ کام کچھ ٹیڑھا ہے نا" وہ سیریس ہوئی۔
"ہاں......مگر ہم تو ہیں نا ایک دوسرے کے لیے۔"
"100%" دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔جہاں سپنے تھے......تو تھوڑا ڈر بھی تھا......خوشی بھی تھی مگر نمی کا احساس بھی تھا۔لمحوں میں دونوں نے ان تمام جذبات پر قابو پالیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں دیر تک گھومتی رہیں۔خاموشی کی ایک گہری چادر ان کے بیچ حائل تھی۔معاشی اعتبار سے خود کفیل، پر اعتماد اور آزاد نظر آنے والی اکیسویں صدی کی یہ لڑکیاں اس وقت زندگی کے اس ہیجان سے گزر رہی تھیں جن کا شائبہ پچھلے وقتوں کی زرق برق لباس میں ملبوس، اوئی اللہ اور ہائے رام کہہ کر آنچل میں منہ چھپانے والی لڑکیوں کو ہوتا بھی نہیں ہوگا۔اور اس وقت بھی وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے شاید راکیش اور انل پاٹھک کو قابو میں رکھنے کے طریقے سوچ رہی تھیں۔چوکیدار ان دونوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔اس نے دھیمی آواز سے گیٹ کھولا اور اسی خاموشی سے وہ اپنے اپنے بستروں میں گھس گئیں۔
راکیش کو لپ اسٹک کا کون سا شیڈ اچھا لگے گا......مونی یہی سوچ کر تمام

شیڈ ٹرائی کر چکی تھی۔ پھر نمرتا کی مداخلت پر اس نے سوٹ سے میچ کرتا ہوا رسٹ کلر چوز کیا۔
نمرتا کی پوری الماری بستر پر الٹی پڑی تھی۔ انل آج کل کچھ سیریس لگ رہا تھا اور اب اسے بھی traditional ہو جانا چاہیے۔ ایک خیال کوندا، اس نے شلوار سوٹ پر دوپٹہ کو پھیلا کر اوڑھا۔ کھلے بالوں کو سمیٹ کر پونی بنائی اور ایک دوسرے کو گڈ لک کہہ کر اپنے اپنے روٹ پر آ گئیں۔

راکیش کو موہنی کی لپ اسٹک کا کلر اچھا لگا...... اس کا مسکرانا اور بھی اچھا لگا...... اور اس پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ لنچ اور پکچر دیکھنا تو اس کو بہت ہی اچھا لگا تھا۔ ہوسٹل کے گیٹ پر موہنی کو چھوڑتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ حالانکہ وہ واقعی متوسط طبقہ کا اور متوسط سوچ کا ہی لڑکا تھا اور ایک بار کالج سے باہر اپنی بہن کو کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ کر اس کو تھپڑ بھی مار چکا تھا اور آج موہنی کے بھولے پن پر مسکراتا آگے بڑھ گیا۔

انل پاٹھک سنجیدہ قسم کا بندہ تھا۔ یا شاید اپنے عہدے کا خیال اس کو زیادہ تھا۔ نمرتا کے لیے قیاس کرنا مشکل تھا۔ ہاں...... کام کے دوران ایک آدھ جملہ وہ ایسا ضرور بول جاتا جو اس پر خمار سا طاری کر دیتا۔ مثلاً:

''ارے بارہ بج گئے تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

''اتنا کام کرنے کے باوجود حیرت ہے تم تھکتی نہیں ہو۔''

''لنچ کہاں لیتی ہو، چلو یہیں منگوا لیتے ہیں۔''

''موٹی تو تم بالکل نہیں ہو۔ پرفیکٹ فیگر۔''

''پرفیکٹ فیگر''...... بہت سارے جملوں کا استعمال کرنے کے بجائے ایک آسان سا سیدھا سادھا...... پرفیکٹ جملہ...... کتنی ہی دیر اس کے کانوں میں گونجتا رہا...... اور اپنے اس پرفیکٹ فیگر کو مین ٹین کرنے کی دھن میں اس نے بہت سی پسندیدہ چیزوں کی قربانی دے دی اور اس وقت بھی تھکن کے باوجود ہوسٹل واک کرتے ہوئے آئی۔

انل پاٹھک نے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کروائی اور انٹیریر ڈیکوریٹر سے میٹنگ کے دوران اسے معلوم ہوا کہ انل پاٹھک کو نیچرل کلرس بہت پسند ہیں۔ نمرتا کی الماری ان شیڈس کے کپڑوں سے بھرنے لگی۔ راکیش کو مغلئی کھانے بہت پسند تھے اور اس کی ماں دہی

بڑے بہت اچھے بناتی ہے، موہنی نے ایسی کتابوں کی تلاش شروع کردی جن میں ان کھانوں کی ترکیبیں تھیں۔اس وقت بھی سمندر کی لہروں کے بیچ دونوں بڑی سی چٹان پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھیں مستقبل کے خالی صفحوں کو پر کر رہی تھیں۔ موہنی نمرتا سے کہہ رہی تھی۔

''یہ رنگ تم پر واقعی کھلتا ہے۔انل پاٹھک نے تم کو ہی نظر میں رکھ کر یہ کلر چوز کیا ہوگا۔''

''سچ'' نمرتا کو محسوس ہوا کہ یہ موہنی نہیں، انل پاٹھک بول رہا ہے۔اس نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر آنکھیں موندلیں اور خوابیدہ لہجے میں بولی۔

''کاش یہ وقت یہیں تھم جائے۔ہم جنموں جنموں تک ایسے ہی بیٹھے رہیں۔''

''یہ لمحے امر ہو جائیں اور موت کے علاوہ ہمارے بیچ اور کوئی نہ آئے۔''

''اب ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔''

گواہ ہے۔

یہ ساحل......یہ سمندر......یہ آسمان......

یہ ہوائیں......فضائیں اور یہ خاموشی......

ہم ایک ہیں......ہم ایک ہیں......ہم ایک ہیں۔

عہدو پیماں کا یہ کھیل پتہ نہیں کب تک چلتا رہا۔زاہدہ غصے سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔

''کون ہے'' نمرتا نے موہنی کا ہاتھ اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے ناگوار لہجے میں کہا۔پھر دونوں ایک ساتھ اٹھ بیٹھیں شاید رات کی جنونی کیفیت دونوں کو یاد آ گئی اور وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔

نمرتا آفس سے بہت دیر میں لوٹی تو موہنی کو میز پر رکھے ایک پیکٹ کو ایک ٹک گھورتے ہوئے پایا۔اپنی حالت سے بے خبر وہ موہنی کے پاس پہنچی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا'' موہنی نے سر اٹھایا۔ڈبڈبائی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

''راکیش کی ماں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔یہ ان کی منگنی کی مٹھائی ہے۔'' وہ زور زور سے رونے لگی۔

’’مت رو موہنی......مت رو......دیکھو میں بھی تو نہیں رو رہی ہوں۔آج انل پاٹھک کی گرل فرینڈ آفس آئی تھی۔وہ کل ہی لندن سے لوٹی ہے۔اس نے خاص طور سے اس کو مجھ سے ملوایا۔‘‘اور وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔یکا یک موہنی اٹھی اور اسے کس کر گلے سے لگالیا۔

’’تم رو رہی ہو......ہنسو نمرتا ہنسو......ہم ہیں نا ایک دوسرے کے ساتھ۔‘‘اور وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں۔آواز آس پاس کے کمروں تک گئی۔ساری لڑکیوں نے پہلے سہم کر ان دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھا۔پھر ایک ایک کر کے سب ہنسنا شروع کر دیتی ہیں اور پورا ہوسٹل قہقہوں میں گم ہو جاتا ہے۔گیٹ پر کھڑے افراد اندر کی جانب دیکھتے ہیں،نظر کچھ نہیں آتا،بس چاروں طرف سے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں،چوکیدار ہوسٹل انچارج کو فون کرتا ہے۔آس پاس کے لوگ بھی ہنسی کی آواز سن کر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔انچارج کے آنے پر سب اندر گھستے ہیں مگر اب وہاں موت کا سناٹا طاری ہے۔سب کمرے اندر سے بند ہیں۔

کھوکھلے رشتے

بڑے شہروں میں کرایے کا گھر تلاش کرنا کسی جدوجہد سے کم نہیں ہوتا اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا۔ چار دن سے مستقل میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے کا چکر لگا رہی تھی، ڈھیروں فون کالز کیے۔ ملنے جلنے والوں سے مدد مانگی تب کہیں جا کر یہ گھر ملا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ محنت رنگ لاتی ہے، میرے لیے یہ محاورہ درست نکلا، کیونکہ دو کمرے اٹیچ باتھ روم، کچن اور خاص کر بالکونی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ یہاں بیٹھ کر کوئی اچھی سی کتاب یا پھر میگزین پڑھنے کا الگ ہی مزہ رہے گا اور ہاں اس جگہ پر چٹائی بچھا کر میں سکون سے یوگا کرسکتی ہوں...... ورنہ اس اکلوتے کمرے میں مَیں جب بھی Meditate کرنے بیٹھتی، اسی وقت اجیت کو کان پھاڑنے والے میوزک پر Aerobics کا خیال آجاتا اور پھر کیا تھا، شادی سے پہلے پیار محبت کے دعوے کا انجام لڑائی اور تکرار سے ہوتا جس کا خمار ہم دونوں پر ہی کئی دنوں تک چھایا رہتا۔ اس بیچ اجیت کہیں ٹور پر۔ چلے جاتے اور ایک دو دن کی یہ جدائی ان کی واپسی پر ایک خوشگوار موڑ لے آتی۔ کچھ دن سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا اور پھر...... مگر یہاں دو کمرے اور یہ بالکونی ہمارے بیچ کی تلخی کو کم کرنے میں ضرور معاون ثابت ہوگی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

''گھر پسند آیا'' مکان مالکن نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا ہے' ہمیں سوٹ کرے گا۔''

''ہم نے یہ پورشن خاص طور سے اپنے بیٹے بہو کے لیے بنوایا ہے۔ مگر دونوں پڑھائی کے لیے ایبروڈ ہیں۔ جب تک واپس نہیں آتے تم لوگ رہ سکتے ہو۔'' انہوں نے فخر سے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارے پتی ساتھ نہیں آئے۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''وہ ٹور پر گئے ہیں۔ ہم کل تک شفٹ کر لیں گے۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''تمہارے پتی بھی دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔ یہ سب کام دونوں کی مرضی سے ہونا چاہیے۔'' وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولیں جسے میں نے ان سنا کر دیا۔

''کرایا طے کر لیں۔''

''ارے تم لوگ میرے بہو بیٹے کی طرح ہو زیادہ تھوڑی لیں گے۔ دونوں دیکھ لو پھر۔''

''میں نے آپ کو بتایا نا وہ کمپنی کے کام سے گئے ہیں چار دن بعد ہی لوٹیں گے اور اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کل آجاؤں۔''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔ نیا نیا جوڑا گھر میں رہے گا تو چاروں طرف رونق رہے گی۔ ہم دونوں گھر میں اکیلے ہیں وہ میرے بہو بیٹے......''

''ایبروڈ پڑھنے گئے ہیں ابھی بتایا تھا آپ نے۔''

میں نے ان کا جملہ پورا کیا۔

اور پھر دو دن انتہائی مصروفیت بھرے گزرے میں نے آفس سے چھٹی لے لی اور اپنی دوست انیتا کی مدد سے سامان سیٹ کیا۔ نہا دھو کر گیلے بالوں کو تولیہ میں لپیٹے میں نے کافی بنائی اور بالکونی میں بیٹھ گئی۔ انیتا نے یہاں جھولا ڈالنے کا مشورہ دیا تھا اور میں کافی پیتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ یہاں پر جھولا ٹھیک رہے گا یا کین چیئر...... تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے تم...... گھر ڈھونڈنے میں پریشانی تو نہیں ہوئی۔''

''کچھ مت پوچھو...... تین چار دروازے کھٹکھٹا چکا ہوں اب بھی ڈر رہا تھا کہ کوئی انجانا چہرہ کھڑکی سے سر نکال کر پوچھے گا آپ کو کس سے ملنا ہے۔''

''میں نے پورا پتہ تو بتادیا تھا۔''

''مگر تم شاید یہ بھول گئیں کہ یہاں پر ہم دونوں ہی اجنبی ہیں اور نام یا شکل دونوں سے ہی ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ شکر کرو مجھے ادھر اُدھر بھٹکتے دیکھ کر تمہاری مکان مالکن مل گئیں اور میری شکل غور سے دیکھنے کے بعد کہا اجیت ہو تم...... پہلے تو میں گھبرایا۔ یہ سی۔ بی۔ آئی کیوں میرے پیچھے لگ رہی ہے۔''

''بہت اچھے اور پر خلوص لوگ ہیں، ریٹائرڈ ہیں مگر Spirit میں ہم سے کہیں آگے۔'' میری بات کی اجیت نے تائید کی۔

''اچھا گھر دیکھو، تم کو پسند ہے۔''

''ارے بھئی جب تم نے پسند کرلیا تو کیا مجال کہ تمہاری کسی بات کو ناپسند کرنے کی جرأت کریں۔'' بالکونی کو سراہتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ ٹور کیسا رہا۔''

''بہت اچھا اور کامیاب بہت اچھا وقت گزرا But I missed you۔''

''میں نے بھی تم کو بہت مس کیا۔'' ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے میں نے کہا تبھی گھنٹی بجی۔

''کون ہوسکتا ہے۔'' کہتے ہوئے اجیت نے دروازہ کھولا۔

''آج پہلی بار تم اس گھر میں آئے ہو کرایہ کا سہی، گھر تو گھر ہی ہوتا ہے۔ جہاں آدمی سکون اور چین کا کچھ لمحہ گزارے۔'' مکان مالکن نے پوجا کی تھالی اجیت کے سامنے کی اور پھر ہم دونوں کو ٹیکہ لگایا اور پرساد دیا۔ ہم نے ان کے پاؤں چھوئے، ڈھیروں آشیرواد دیتی ہوئی وہ چلی گئیں۔ ایک خوشگوار احساس دلا کر۔

''کتنا اچھا لگا آنٹی کا یہ خلوص'' اجیت بولے۔

''ہاں اور ان دو دنوں میں پڑوسیوں سے لے کر سبزی اور دودھ والے تک سے میری پہچان کرادی۔ محلے بھر کی آنٹی ہیں۔کافی سوشل اور پاپولر ہیں۔''میں نے آنٹی کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

''ارے بھائی کچھ کھانے کو ملے گا یا پھر آنٹی کے بارے میں سن کر ہی پیٹ بھرنا ہوگا۔''اجیت نے فریج کھولتے ہوئے کہا۔

اس گھر میں آرام تو بہت ہوگیا تھا مگر ساتھ ہی لے آیا تھا تنہائی اور اکیلے پن کا احساس۔ہم دونوں کے بیچ بڑھتی ہوئی دوری......

اجیت کا تیز میوزک پر Aerobics کرنے کا شوق پورا ہوگیا تھا۔صبح اٹھتے ہی وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے اپنی اچھل کود میں مصروف ہوجاتے۔میں لیمو پانی کا گلاس لے کر یوگا کے لیے بیٹھ جاتی۔ورزش ختم کر کے وہ اپنا ناشتہ بناتے اور باتھ روم میں گھس جاتے۔میں کچن میں آتی صفائی اور کچھ دوسرے کام کرتی،اس بیچ اجیت تیار ہوکر آفس کے لیے نکل جاتے......تکرار تو دور......بات چیت بھی بس ضرورت کی محتاج رہ گئی تھی۔شام کو اجیت اکثر دیر سے آتے اور کبھی کبھی میں اپنے کام کی وجہ سے مصروف رہتی۔ دوسری طرف آنٹی اور انکل کی پرسکون زندگی......ٹھہراؤ اور Togetherness مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیتے۔

اس دن بھی لیمو پانی کا گلاس ختم کر کے میں نے چائے بنائی اور چٹائی لے کر بالکونی میں آگئی۔تبھی دور سے میں نے آنٹی اور انکل کو سیر کر کے لوٹتے دیکھا۔بے فکری کے عالم میں دونوں باتیں کرتے ہوئے لوٹ رہے تھے مجھے عجیب سی کوفت ہوئی اور اچھی خاصی مزے دار چائے کڑوی لگنے لگی اور میں زبردستی اسے اپنے اندر انڈیلتی رہی۔چائے ختم کر کے میں یوگا کا ارادہ کر کے اٹھی، نیچے جھانکا انکل اخبار پڑھ رہے تھے ان کو اکیلے دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے اس احساس کو کوئی نام دیتی آنٹی اندر سے چائے کی ٹرے لئے آتی دکھائی دیں۔مجھے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرائیں ہاتھ ہلایا میں نے انہیں وش کیا، چائے بناتے ہوئے انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا۔

''اجیت نظر نہیں آئے۔'' کپ میں چینی ڈالتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولیں۔

''دیر تک سونے کی عادت ہوگی۔ پہلے میں بھی بہت سوتی تھی مگر شادی کے بعد سب کچھ بدل گیا اور ویسے بھی صبح سویرے سیر پر جانا صحت کے لیے اچھا ہے۔ دو چار دل کی باتیں ہو جائیں تو دن اچھا گزرتا ہے۔'' مجھے سمجھانے کے انداز میں منہ میرے قریب کر کے وہ بولیں۔ اور اپنی کامیاب زندگی کے گر مجھے غور سے سنتے دیکھ کر اپنی نصیحت کو اور طول دے دیا۔ میں نے گھبرا کر گھڑی دیکھی نو بجنے والے تھے اجیت کے آفس جانے کا وقت ہونے والا تھا۔ کاش کہ وقت تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جائے میں اجیت کی پسند کا ناشتہ بناؤں، ان کی شرٹ کے بٹن بند کروں اور شام کو جلدی آنے کا وعدہ لے کر ہی ان کو جانے دوں۔ میں من ہی من اپنے پلان پر مسکراتے ہوئے سیڑھی کی طرف بڑھی اجیت کی رنگ (Keyring) گھماتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔

''آپ جا رہے ہیں۔'' اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالتے ہوئے میں بولی۔ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے ایک ہوائی بوسہ ہوا میں اڑایا اور اسکوٹر اسٹارٹ کرنے لگے میں تھوڑی دیر ساکت وہیں کھڑی رہی۔

میز پر پھیلی بے ترتیبی کا مطلب تھا کہ اجیت نے ناشتہ ٹھیک سے نہیں کیا۔ پلیٹ میں ٹوسٹ کے ٹکڑے پڑے تھے اور چائے بھی بچی ہوئی تھی۔ آج مجھے دیر سے جانا تھا کیا ہو جاتا اگر میں ان کو ناشتہ بنا کر دے دیتی اپنی لاپرواہی پر مجھے خود ہی غصہ آیا۔ حالانکہ ناشتہ بنانا میری ذمہ داری میں شامل نہیں تھا۔ اجیت اپنا ناشتہ خود ہی بناتے تھے مگر کیا ہو جاتا اگر میں — چلو آج اچھا سا ڈنر بنا کر اجیت کو سرپرائز دوں گی میں ان کی پسند کا کھانا سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی، کچھ ارجنٹ کام سے مجھے فوراً آفس بلایا گیا تھا، سارا پلان بھلا کر میں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ شام کو لوٹی تو آنٹی انکل برآمدے میں چائے پی رہے تھے میرا موڈ اور خراب ہو گیا۔

''تم اکیلی آئی ہو، ہم سمجھ رہے تھے اجیت کے ساتھ کہیں گئی ہو۔'' واپسی پر آنٹی

نے زخم پر نمک لگانے کا کام کیا۔

''وہ ابھی آفس میں بزی ہیں مجھے کام کی وجہ سے رکنا پڑا۔'' مختصر سا جواب دے کر میں زینے کی طرف بڑھ گئی۔ پرس پھینک کر تھوڑی دیر ایسے ہی لیٹی رہی پھر کچن میں آ کر چائے بنائی اور سینڈوچ کھائی۔ کمرے کی تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ دودھ نہیں تھا صبح کے لیے مجھے یاد آیا اور میں دودھ لینے کے لیے نیچے آ گئی۔ برآمدے کی جالی سے ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے آنٹی انکل نظر آئے۔ کھانا کھاتے ہوئے دونوں ٹی وی کا کوئی پروگرام دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ دودھ خریدنے کا ارادہ ترک کر کے میں اوپر آ گئی۔ تھوڑی دیر آفس کی فائل دیکھتی رہی پھر ایک سہیلی کا فون آ گیا اور ادھر اُدھر کی ڈھیروں باتیں کر کے میں اپنے آپ کو ہلکا کرتی رہی اور سو گئی۔ اجیت کب لوٹے مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

میٹنگ کی وجہ سے مجھے آفس جلد پہنچنا تھا۔ اجیت سو رہے تھے میں نے ان کی پسند کا لحاظ رکھتے ہوئے ناشتہ بنایا اور آفس آ گئی۔ کام بہت تھا مگر مجھے یقین تھا اجیت ناشتہ کرنے کے بعد مجھے فون ضرور کریں گے مگر میرا انتظار فضول گیا اور فرصت پا کر میں نے ہی ان کے آفس کا نمبر ملایا۔

''ناشتہ کیا تھا آپ نے۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ارے نہیں!......رات کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا۔ فائیو اسٹار ڈنر تھا مزہ آ گیا۔''

اور وہ خوش ہو کر مجھے ڈنر کی روداد سناتے رہے اور مجھے اپنی صبح کی محنت بیکار جانے کا افسوس ہوتا رہا۔ تبھی اجیت بولے۔

''ارے یار انیتا شام کو تھیٹر چلو گی اچھا پروگرام ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں کس وقت۔'' اور ہم دونوں نے طے کیا کہ میں آفس ختم کر کے سیدھے وہیں پہنچ جاؤں گی۔

آج بہت دنوں کے بعد ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا۔ چلو تنہائی میں ایک ساتھ کچھ وقت ملے گا تو آنٹی کے مطابق ہم کچھ دل کی باتیں کریں گے بہت سارے گلے شکوے تھے......ورنہ آج کل ہم دونوں ہی اپنے اپنے کام میں اتنے مشغول رہتے کہ کسی بات کا

ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ گھر ہمارے لئے محض ایک سرائے تھی جہاں ہم رات گزارتے ورنہ ہماری صبحیں اور شامیں ہمیں کم ہی یکجا کر پاتیں۔ مگر آج کے بعد ہم ضرور ایک دوسرے کو زیادہ وقت دیں گے۔ میں نے اپنے آپ سے بہت سے وعدے کیے۔ ٹیکسی تھیٹر کے پاس رکی میں نے چاروں طرف اجیت کو دیکھا اور پھر مایوسی کے عالم میں ان کی بتائی ہوئی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ کولڈ ڈرنک ہاتھ میں پکڑے اجیت اپنے چار دوستوں کے ساتھ پتہ نہیں کدھر سے آگئے میرا موڈ خراب ہوگیا مگر حالات کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے زبردستی ان کے قہقہوں میں شامل ہوتی رہی اور اس وقت تو مجھے بہت ہی غصہ آیا جب سب ڈنر کے لیے ایک ہوٹل میں گھس گئے۔ اجیت کے دوست نے اپنی گاڑی سے ہمیں گھر تک ڈراپ کیا۔ اجیت آتے ہی بستر میں گھس گئے اور میں کچن میں آکر صبح کے برتن دھونے لگی۔

اس دن میں آفس سے جلدی لوٹ آئی۔ بارش کے آثار تھے اور میرا اندازہ صحیح نکلا۔ بونداباندی راستے میں ہی شروع ہوگئی تھی گھر پہنچتے ہی طوفانی بارش ہونے لگی۔ بالکونی میں آتی بوچھار میں کافی مزہ آرہا تھا۔ میں تھوڑی دیر بھیگتی رہی پھر اپنی پسند کا ریکارڈ لگایا، کافی بنائی اور میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ شام رات میں تبدیل ہونے لگی تو میں اندر آگئی۔ تبھی بیل بجی۔

''اجیت شاید آگئے۔'' میں نے دروازہ کھولا۔ مگر گھبرائی گھبرائی سی آنٹی کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا۔'' ان کی شکل دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔

''تمہارے انکل مارکیٹ گئے ہیں میری دوائیں لینے۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔ اتنی تیز بارش میں پتہ نہیں کہاں ہوں گے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ پانی بھرا ہوگا۔ نا ٹارچ ہے ان کے پاس اور نہ ہی چھتری۔'' وہ رک رک کر مجھے بتاتی رہیں۔

''آرہے ہوں گے ابھی ابھی تو بارش رکی ہے۔'' میں نے ان کو تسلی دی اور انہیں کے ساتھ نیچے آگئی۔ وہ بار بار گیٹ تک جاتیں اور اندر آتیں۔

''کتنا گہرا اندھیرا ہے۔ اسٹریٹ لائٹ بھی اتنی خراب ہے نیتاؤں کو اپنی جیبیں بھرنے سے ہی فرصت نہیں۔'' برآمدے میں سلیپر اور تولیہ رکھتے ہوئے وہ بولیں۔ میں نے تھرمس اٹھا کر دیکھا اس میں چائے شاید بھری رکھی تھی انہوں نے اٹھاتے ہوئے مجھے دیکھا

تو بولیں۔

''تمہارے انکل کے لیے بنا کر رکھی ہے۔موسم ٹھنڈا ہو گیا ہے تم چاہو تو پی لو۔''
خواہش کے باوجود میں نے انکار کر دیا۔

''آنٹی آپ اور انکل ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔پسند کی شادی ہو گی آپ کی۔''میں نے انہیں کریدا۔

''ہٹو بھی۔''وہ شرما گئیں پھر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''پہلے یہ سب کہاں ہوتا تھا۔تمہارے انکل پڑھ رہے تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی۔تمہارے انکل کے کہنے پر ہی میں نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور اپنے سسرال اور میکہ دونوں جگہ سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی مانی جاتی تھی۔تمہارے انکل کی خواہش تھی کہ میں بی۔اے کروں مگر گھر گرہستی اور بچوں میں موقع ہی نہیں ملا۔پھر ٹرانسفر والی نوکری، کبھی یہاں کبھی وہاں۔''

''ایک دوسرے کا کتنا خیال رہتا ہے آپ لوگوں کو آجکل تو......''

''اب ایک دوسرے کا ہی سہارا ہے۔ایک دوسرے کی عادتیں اپنا کر کبھی جھک کر کبھی جھکا کر نبھنے لگتی ہے اور زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ایک دوسرے کا ساتھ، آپسی سمجھوتہ......ایک دوسرے کی خوشیوں کا خیال...... یہاں تک کہ کبھی کبھی بری عادتیں بھی اچھی لگنے لگتی ہیں، عادی ہو جاتا ہے انسان اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جینے کا......اور تبھی جا کر شادی شدہ جیون کا سکھ ملتا ہے اور اسی میں عورت کا مان بھی ہے۔''

تبھی گیٹ کھلا اور انکل دکھائی دیئے۔آنٹی ادھر دوڑیں اور میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔کاش کہ اجیت آجاتے۔مگر مجھے پکا یقین تھا کہ اس موسم کی خوبصورتی کا مزہ وہ کسی بار میں دوستوں کے ساتھ لے رہے ہوں گے۔وہ انکل نہیں ہیں......مگر میں بھی تو آنٹی نہیں بن سکتی۔

کتنی پتہ کی بات کہی تھی آنٹی نے، ایک دوسرے سے سمجھوتہ کرنے میں ہی زندگی کا اصل سکھ ہے۔جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ہم نے سمجھوتے کی راہیں پہلے ہی بند کر دی

تھیں۔ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کو الگ رکھنے کا فیصلہ ہم دونوں کا ہی تھا۔ایک دوسرے کو Breathing Space دینے کا وعدہ ہم دونوں نے ہی کیا تھا۔اجیت کو پروفیشنل لڑکی کی تلاش تھی۔میں ایم۔بی۔اے کرنے کے بعد ایک کمپنی میں ٹرینی کی حیثیت سے کام کررہی تھی۔ایک جوش اور امید کے سہارے، میں ایک ایسے گھرانے کی پروردہ تھی جہاں مردوں کی بالادستی قائم تھی۔انگریزی تعلیم پھر قسمت اور حالات کا ساتھ، میں نے ایم۔بی۔اے پورا کرلیا۔یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔لیکن دہلی جیسے شہر میں اکیلے رہ کر نوکری کرنے کا میرا باغیانہ فیصلہ قبول کرنے میں گھر والوں کو کافی وقت لگا۔مگر پھر اسے مغربی تعلیم کی دین سمجھ کر سب قائل ہوگئے۔اپنی محنت اور لگن سے جلد ہی میں Executive بن گئی۔اسٹاف میں مجھے کئی مرد حضرات سے برتری حاصل ہوگئی۔میں نے ہمیشہ عورت کو محکوم اور مرد کو حاکم کی حیثیت سے دیکھا تھا مگر اب مردوں کو آڈر دیتے ہوئے مجھے عجیب سی تسکین ملتی۔اپنی آزادی اور حیثیت کا مزہ میں پوری طرح لے رہی تھی، ایک دن اجیت کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں ہماری کمپنی آئے، باتیں ہوئیں، فون نمبر کا تبادلہ ہوا، پھر ملاقاتیں ہوئیں۔امریکہ سے سوفٹ ویئر (Software) کا کورس کر کے لوٹے اجیت کے جادوئی سحر میں مَیں کھوسی گئی۔اور چند مہینوں میں ہی ہم نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔اجیت نے بہت صاف لفظوں میں اپنے خیالات مجھ پر ظاہر کردئے تھے۔مثلاً وہ میری نوکری کو لے کر کبھی مداخلت نہیں کریں گے مجھے اپنے فیصلے خود لینے کا اختیار ہوگا۔شادی کے بعد اپنی باتوں پر وہ پوری طرح قائم رہے۔مگر ان کے ذریعے دی گئی آزادی زندگی کو خوشگوار بنانے کے بجائے نامکمل ہونے کا احساس دلاتے ہوئے میری تنہائی اور اداسی کا سبب بن گئی۔مجھے لگتا اجیت مجھ سے دنیا کی بدلتی ہوئی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کے بجائے میرے اندر ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کو محسوس کریں۔میرے جذبات جاننے کی کوشش کریں اور اپنی زبان سے میری خواہش کا اظہار کریں۔کتنا صحیح کہا تھا آنٹی نے آپس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم بانٹنے میں ہی اصل زندگی کا مزہ ہے۔

مگر......ہم نے تو اپنی زندگی کی شروعات ہی ایک افسانوی پیرائے میں کی تھی تو

پھر رشتوں کی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑے ہو کر ہم حقیقی خوشیوں کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔ میں ترازو لے کر اپنے رشتے کا موازنہ کرتی رہی۔ جوڑ، گھٹاؤ، ضرب اور تقسیم سب کر کے دیکھا مگر جمع حاصل صفر ہی آیا۔ کتنی غلطی پر تھے ہم دونوں جو سمجھوتہ کی راہ پہلے ہی بند کر لی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ آنٹی نے وقت رہتے میری آنکھیں کھول دی تھیں، مگر...... کیا اجیت میری باتوں کو سمجھ سکیں گے۔

شاید ہاں...... اسی سنسکرتی اور تہذیب کے پیداوار وہ بھی تو ہیں ان کی گھٹی میں بھی رشتوں کی یہی گہرائی اور احترام بسا ہوگا جسے مغرب کی ہوا نے ترقی کی تہوں میں چھپالیا ہے۔ شاید ان کا ہندوستانی دل ابھی بھی زندہ ہو۔ مجھے صرف ان پرتوں کو اتار کر رشتوں کا مفہوم انہیں سمجھانا ہے۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں خود سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی۔ گہرے گھنے بادل غائب ہو چکے تھے آسمان بالکل صاف تھا اور چاند تاروں کے بیچ جگمگا رہا تھا۔ میں نے بالوں کو جوڑے کی شکل دی۔ بڑی سی بندی لگائی، منگل سوتر پہن کر میں نے اپنی بھاری ساڑی کا پلّو ٹھیک کیا۔ اس روپ میں اجیت پہلی بار مجھے دیکھیں گے۔ ہماری کورٹ میرج ہوئی تھی اس دن بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اچانک میٹنگ طے ہوگئی تھی اور میٹنگ کے بعد اسی حلیے میں اجیت مجھے رجسٹرار آفس لے آئے تھے۔ نا مہندی لگی، نا ڈھولک بجی، نا بارات ہی سجی تھی اور نا ہی میں دلہن بنی تھی۔ مگر ہماری شادی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں کوئی احساس پنپتا، اجیت کو کمپنی کے کام سے جاپان جانا پڑا۔ زندگی کی اپنی روٹین شروع ہوگئی اور وقت گزرنے لگا۔

مگر آج اچانک میرے دل کے تار جھنجھنا اٹھے، کیا اجیت ان تاروں پر لفظوں کے موتی پرو سکیں گے، میرے اندر چھپے جذبات کو اپنی آواز دے سکیں گے۔ شاید ہاں...... یا شاید نہیں۔ میرے اندر وسوسے جنم لے رہے تھے تو کہیں سے اجالے کی کرن بھی دکھائی دے رہی تھی، میرے خوابوں کا انحصار انہیں لمحوں پر محیط تھا۔ میں محکوم بن کر زندگی گزارنے کے حق میں بالکل نہیں تھی مگر ایک چھت کے نیچے اجنبیوں کی طرح زندگی گزار کر تھک چکی تھی

اور مجھے یقین تھا کہ اجیت کا ہندوستانی دل میرے خوابوں کو حقیقت کا لباس ضرور پہنائے گا
اس تصور سے ہی میرا دل کانپ گیا اور میں سسک پڑی۔

بیل بجی۔ انداز اجیت کا تھا مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ آنکھ پونچھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ تم ہو نا، گھر تو شاید ہمارا ہی ہے۔'' چاروں طرف دیکھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے انہوں نے خوشگوار موڈ میں کہا۔ میں شرما گئی تو میرے پاس آ کر انہوں نے سرگوشی کی۔

''میرے خوابوں میں ایک ایسی ہی لڑکی بسی تھی۔ جسے میرا دل ہمیشہ پکارا کرتا تھا۔ میرے دل کی بات آج تم تک کیسے پہنچ گئی۔''

''وہ آنٹی نے......''

''اس وقت صرف اپنی باتیں ہوں گی۔ نو آنٹی۔'' اور ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

گھروندا

تیز رفتار سے چلتی موٹر سائیکل کا پہیہ گھر گھراتے ہوئے اچانک ایک ویران راستے پر رُک گیا اور کئی بار اسٹارٹ کرنے کی میری کوشش نا کام رہی۔ اب کیا کیا جائے۔

شروع اکتوبر کی خوشگوار شام نے بہت جلد اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی چاروں طرف ہرے بھرے کھیت تھے۔ ایک عجیب سا نظارہ میرے سامنے تھا اور ہلکی ہلکی ہوا نے جیسے مجھے بے خود کر دیا۔ اپنی پچیس سالہ زندگی میں شاید پہلی بار میں نے ایسی خوبصورتی کو محسوس کیا تھا۔ اپنا مشن بھول کر میں نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی پر چلتا گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر اور کتنی دور...... چھوٹی چھوٹی کئی بستیوں کو میں نے پار کیا تھا۔ مگر اب میرے پاؤں بری طرح تھک چکے تھے اور بھوک سے بھی میں بے حال ہو رہا تھا مگر آبادی کی تلاش میں چلتا رہا۔ سامنے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آئیں تو مجھے کچھ سکون ہوا اور میں چلتا ہوا بے اختیار ایک جھونپڑی کے سامنے رُک گیا چھوٹے سے دروازے کو بجانے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا تو وہ خود بخود کھل گیا۔ میں نے اندر جھانکا۔ مگر باہر کے مقابلے یہاں زیادہ اندھیرا تھا اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک کونے میں چراغ جل رہا تھا مگر وہ بھی اندھیرے کو کم کرنے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکا اور مجھے کوشش کے باوجود کچھ نظر نہیں

آیا میں زور سے کھانسا۔

''کون ہو بھائی'' کونے سے ایک بے جان سی آواز آئی۔

''پردیسی ہوں۔ راستہ بھٹک گیا ہوں۔ کیا آج رات مجھے پناہ ملے گی''، خلاف عادت میں بہت سنجیدگی سے بولا حالانکہ میرا ہاتھ شرٹ کے نیچے خود بخود چلا گیا تھا جسے کوشش کر کے میں نے قابو میں کیا۔

''ادھر ہی آجاؤ کچھ کھاؤ گے۔''

''ہاں'' بولتے ہوئے میں آواز کی سمت بڑھا۔ دوسری طرف سے چھم کی آواز کے ساتھ ایک عورت آنچل سنبھالتی ہوئی اٹھی اس نے چراغ کی لو کو تیز کیا تو ملگجا سا اجالا آس پاس پھیل گیا جھونپڑی اندر سے میری توقع کے خلاف کافی بڑی تھی اور ہر سامان سلیقے سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا ایک پلیٹ میں روٹی اور سالن کا کٹورا میرے سامنے رکھ کر وہ عورت اپنی جگہ واپس چلی گئی۔ بھوک اتنی شدید تھی کہ میں نے آدھا کھانا ختم کرنے کے بعد اس پر توجہ دی۔ موٹی موٹی روٹیاں اور دال...... ایک لمحے کے لیے میرا ذہن بھٹکا اور میں یاد کرنے لگا کہ ایسا کھانا کب اور کہاں کھایا تھا۔ ایک تکرار سی ذہن میں تھی جو آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ حالانکہ اب تو مرغ اور مچھلی کے بغیر کھانے کا تصور ہی نہیں تھا میرا۔ وہ بھی زیادہ تر شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں، تیز روشنیوں کے بیچ۔ مگر اس وقت بھوک اور تھکن اتنی زیادہ تھی کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہ گیا تھا۔ دال اور روٹی میں نے ختم کی اور پانی پی کر پاس بچھے بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ شاید صبح ہو رہی تھی جب میری آنکھ کھلی۔ آس پاس کا جائزہ لیا تو مجھے رات کا حادثہ یاد آیا۔ ملے جلے خراٹوں سے اندازہ ہوا کہ یہاں اور بھی کئی لوگ تھے۔ ایک عجیب سی گھٹن ماحول کو اپنے اندر سمیٹے تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا میں باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی ہوا نے میرے حواس درست کیے اور میں تھوڑی دور پر صاف ستھری جگہ دیکھ کر لیٹ گیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہو رہی تھی اور اندھیرے کا غلبہ کم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا موبائیل فون باہر نکالا اور انداز سے نمبر دبایا مگر یہ جگہ شاید رینج سے باہر تھی۔ ہیڈکوارٹر والے ضرور پریشان ہوں گے کیا کیا جائے۔ بار بار فون ٹرائی کرنا بے سود تھا۔ جس

جگہ موٹر سائیکل خراب ہوئی تھی وہ جگہ یقیناً یہاں سے دور ہوگی کیونکہ رات میں شاید بہت دیر تک چلتا رہا تھا اور پھر اسی وجہ سے مجھے نیند بھی گہری آئی تھی۔ بس ایک بات اطمنان کی تھی کہ موٹر سائیکل دیکھ کر کوئی میرا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ بے چینی سے ٹہلتے ہوئے میں پھر نمبر دبانے لگا اور جبھی مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی ہے۔ شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے میں مڑا مگر پھر میرے ہاتھ اور قدم دونوں ہی رُک گئے۔

''کون ہو تم؟'' کم سن سی بڑی بڑی آنکھوں والی وہ ایک لڑکی تھی۔ ''جلدی اٹھ گئے۔ زمین پر شاید نیند نہیں آئی ہوگی۔ شہری ہو نا۔'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولی اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میں نے رات اسی کی جھونپڑی میں گزاری تھی۔

''تم کو تو زمین پر نیند آتی ہوگی۔ پھر تم کیوں جلدی اٹھ گئیں۔'' میں نے اس کا جملہ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ تو ہمارا مقدر ہے۔'' وہ شاید برا مان گئی تھی۔

''میں مقدر کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن اتنی صبح...... تم اکیلے یہاں؟''

''میں اکیلی کہاں ہوں۔ تم ہو نا میرے ساتھ...... ہونا۔'' اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے براہِ راست مجھے دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ اس کا بھولا بھالا انداز، تیکھے نقوش، الجھے بالوں کو سلجھانے کا عجیب سا انداز، صبح کی ہلکی دھوپ میں اس کا نکھرا رنگ روپ، معصومیت سے پُر چہرا۔ مجھے حیرت تھی اپنے آپ پر جو اس طرح ڈگمگا رہا تھا۔ ''ہونا میرے ساتھ۔'' مجھے لگا وہ پھر مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ مگر نہیں وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر زمین میں بیٹھی کچھ کر رہی تھی۔ کیا...... یہ میں دیکھ نہیں سکا۔ مگر تکرار میرے ذہن میں مسلسل ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں جذبات میں بہہ جانے والا کوئی فلمی ہیرو نہیں تھا۔ بلکہ میری شرٹ کے نیچے ہر وقت جدید تکنیک کا لوڈیڈ پستول اور جیب میں ایک دو فوٹو مع تفصیل کے میرے پاس رہتے تھے کیونکہ میں ایک پروفیشنل قاتل تھا یہی میرا پیشہ تھا جسے میں پوری ایمانداری کے ساتھ نبھاتا تھا۔ ''مگر اس چلتے پھرتے جسم میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہوتا ہے جو بڑا بے ایمان ہوتا ہے اور لمحوں میں انسان کو ڈگمگا دیتا ہے لیکن لمحوں کے اسی

پھیر کو قابو میں کرنے والا ہمارے پیشے کا شہنشاہ ہوتا ہے۔'' باس کی بات مجھے یاد آئی۔ میں پھسلا۔ مگر گرنے سے پہلے ہی سنبھل بھی گیا۔ اپنے حواس درست کیے۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش چھوڑے اور اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں کوئی عام انسان نہیں بلکہ اپنے پیشے کے لحاظ سے ایک اکھڑ، بے رحم، سفاک اور نڈر قاتل ہوں جس کی جیب میں کبھی کسی بلڈر، نیتا یا پھر افسر کی تصویر رہتی ہے۔ میں اپنی فیلڈ میں پرفیکٹ ہوں کیونکہ نہ تو کبھی میرا منصوبہ فلاپ ہوا تھا اور نا ہی کبھی نشانہ چوکا تھا۔ ہاں مہینوں اخبار اور ٹی وی والے مجرم کی تلاش میں سرگرداں رہ کر خود ہی خاموش ہو جاتے اور کوئی سرا ان کے ہاتھ نا لگتا۔ کل بھی میں ایک ایسے ہی مشن پر نکلا تھا۔ اور کاموں کی بہ نسبت یہ کام آسان بھی تھا۔ شہر کے ایک مشہور بزنس مین نے اپنا resort بنانے کی تیاری مکمل کر لی تھی مگر عین وقت پر انجینئر نے کلیرنس دینے سے انکار کر دیا۔ رشوت کے وہ خلاف تھا اور اسے دنیا سے اٹھانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ کام آسان تھا سیکورٹی کی مجبوری بھی نہیں تھی۔ گیسٹ ہاؤس میں رات ہی کو پہنچ کر دو گھنٹے بعد لوٹنے کا کہہ کر میں فلیٹ سے نکلا تھا دنیا کی کوئی طاقت میری پلاننگ کے بیچ نہیں آتی تھی۔ مگر رات میری موٹر سائیکل نے اور اب ایک معمولی سی لڑکی نے میرے ہوش اڑا دیئے تھے...... مجھے تعجب ہو رہا تھا اور میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہ رہا تھا۔

''ارے تم ابھی تک وہیں کھڑے ہو۔ آؤ۔'' اور میں واقعی اس کی سمت چل پڑا۔ کوئی جادوگرنی ہے کیا۔ کالا جادو جانتی ہے یا پھر ہپنو ٹائز کرنا۔

''بیٹھو۔'' اس نے جیسے مجھے حکم دیا۔

''کہاں۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''یہ گھروندا دیکھو میں نے بنایا ہے ابھی پورا خالی ہے۔ تم جہاں چاہو بیٹھو۔ اچھا ہے نا۔'' میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولی اور مجھے لگا جیسے میرا پورا وجود اس کے ایک لفظ سے ہل گیا ہو۔ گھروندا...... گھروندا کب بنا تھا میں نے ایسا گھروندا۔ کہاں؟ سوچیں مجھے گھیرنے لگیں۔ ''تمہاری طبیعت خراب لگتی ہے۔ بخار ہے کیا'' میرے ماتھے پر اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھا۔

''نہیں تم میرے لئے پانی لے آؤ۔''

وہ پانی لینے گھر کی طرف مڑی، میں نے اٹھ کر سامنے بنے چھوٹے سے گھروندے کو دیکھا۔صاف ستھرا...... چکنا...... روز اس پر چکنی مٹی کا لیپ لگاتی ہوگی...... مگر یہ سب مجھے کیسے معلوم...... دماغ میں ہلچل سی ہوئی اور پھر ایک ایک کر کے پردے ہٹتے گئے۔

بابوجی کی حویلی میں میں ماں کے ساتھ جاتا تھا۔ماں صبح سے شام تک حویلی کے پچھواڑے کام کرتی رہتی تھی کبھی گھاس کاٹتی...... کبھی بھینسوں کو چارہ ڈالتی۔میں ماں کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔وہیں پر بھینسوں کو نہلاتے دھلاتے نندو اور بیرو کو بھی میں نے دیکھا تھا۔بیرو ماں سے اکثر کچھ نہ کچھ کہتا رہتا، کیا...... یہ میں نہیں سمجھ پاتا مگر اس کی بات سن کر ماں کبھی لڑتی یا پھر غصے سے اس کی طرف دیکھتی۔ایک دن وہ جلیبی لے کر آیا اور مجھے دے دیا۔میں خوشی خوشی جلیبی کھانے لگا۔ماں نے دیکھتے ہی دونا میرے ہاتھ سے کھینچا اور اس کے منہ پر دے مارا۔اس دن سے اس نے ماں سے کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا۔ماں خاموشی سے کام کرتی اور دوپہر کو آم کے بڑے سے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ہم روٹی کھاتے۔ماں پھر کام پر لگ جاتی اور میں آس پاس کی مٹی بٹورتا اور کچھ نہ کچھ بناتا بگاڑتا رہتا۔اس دن بارش ہوئی تھی۔آس پاس کی مٹی گیلی تھی۔میں نے مٹی کا ڈھیر لگایا تبھی ماں آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک خوبصورت گھروندا بنا دیا۔

''کتنا اچھا ہے نا ماں۔''

''ہاں ابھی گیلا ہے۔کل تک سوکھ جائے گا۔پھر اس پر چکنی مٹی کا لیپ لگانے سے یہ اور اچھا ہو جائے گا۔'' ماں نے ٹوٹی لکڑیوں کا گٹھر اٹھاتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن ماں کے ساتھ حویلی پہنچتے ہی میں چکنی مٹی گھولنے لگا۔ماں نے گھروندے کو بڑی محنت سے لیپا۔کام کرتے ہوئے ماں کے چہرے پر ایک عجیب سی بیزاری اور تھکاوٹ نظر آتی تھی مگر اس وقت وہ بہت مہارت سے اپنے کام میں لگی تھی۔ماں کے نفاست سے چلتے ہوئے ہاتھ مجھے بہت اچھے لگ رہے تھے۔پھر وہ اٹھ گئی اور میں آس پاس کی زمین برابر کرنے لگا۔

''گھروندا بنا رہے ہو۔'' میرے پیچھے سے آواز آئی اور میں نے مڑ کر دیکھا۔ چمکیلی سی فراک، بالوں میں کلپ لگائے اور جوتا موزہ پہنے وہ میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔ کون تھی وہ...... وہی شاید جس کی ہنسی میرے خالی گھروندے میں گونجنے والی تھی مگر میں چپ چاپ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ عجیب سی خوشبو بسی تھی اس کے جسم میں۔ میں نے ایک نظر اپنے میلے کچیلے کپڑوں پر ڈالی۔ مٹی میں سنے ہاتھوں کو دیکھا اور خود ہی اس سے دور کھسک گیا۔

''تم نے بنایا ہے یہ گھر۔ ہائے کتنا اچھا ہے۔'' وہ گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں اچھا لگا؟ تم رہوگی اس میں؟'' میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''تم آنے دوگے تو ضرور رہوں گی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تم کہاں سے آئی ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا تم کو۔''

''یہ تو میرا ہی گھر ہے۔ آج اسکول کی چھٹی ہے اور......''

''کیا؟'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''تم تو مالکن ہو......''

''میں مالکن نہیں بچی ہوں۔ بٹینا نام ہے میرا۔ مجھ سے دوستی کروگے؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے سر ہلا دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کیک کا پیکٹ تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ کتنا مزے کا تھا۔ منہ میں رکھتے ہی گدگدا سا لگتا۔ اس نے مجھے اور دیا تو میں نے اسے چھپا کر جیب میں رکھ لیا اور واپسی پر زبردستی ماں کے منہ میں ٹھونس دیا۔

''کتنا اچھا ہے ناماں۔ میٹھا بھی اور گدگدا بھی۔ منہ میں رکھتے ہی اندر چلا جاتا ہے۔ چبانا بھی نہیں پڑتا۔'' اور ماں ہنس دی۔

''کتنی اچھی قسمت ہے ان حویلی والوں کی۔ نہ کھیتوں میں کام کرنا ہے اور نا ہی محنت مزدوری۔ کھانا بھی ایسا کہ منہ میں رکھتے ہی اندر چلا جائے۔''

شاید ماں بھی یہی سوچ رہی تھی اسے اس رات دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔

اب میں روز صبح جلدی اٹھنے لگا تھا ماں روٹی پکاتی۔ جلدی جلدی کھا کر میں ماں

سے حویلی چلنے کی ضد کرتا۔ ٹینا کی چھٹیاں تھیں وہ بھی آ جاتی۔ روز وہ کوئی نہ کوئی نئی چیز لاتی نیا نام نیا مزہ...... پھر ہم گھروندا بناتے۔ میں حویلی کے باہر کھیت کھلیان بناتا اور وہ اندر کے کمروں کے لیے پتہ نہیں کیا کیا بناتی اور سجاتی۔ کبھی کبھی ماں بھی آ کر بیٹھ جاتی اور اس کی باتوں پر ہنستی۔

اس دن ہم حویلی جلدی پہنچ گئے۔ ٹینا ابھی نہیں آئی تھی میں نے چکنی مٹی گھولی اور جلدی جلدی گھروندے کو اور چکنا کرنے میں جٹ گیا۔ بڑا سا پیکٹ لیے لال رنگ کی فراک پہنے ٹینا ہنستی ہوئی آ گئی اور پیکٹ میرے سامنے کر دیا۔

''لو کھاؤ۔'' میں نے مٹی میں سنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔

''اچھا تم منہ کھولو میں کھلا دیتی ہوں۔''

میں نے منہ کھولا۔ ٹینا نے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے زور سے مجھے جوتوں سے دھکا دیا۔

''سالا عیاشی کرنے یہاں آتا ہے۔'' اور مجھ پر اس کے بھاری بھاری جوتے پڑنے لگے۔ ماں چیختی چلاتی ہاتھ جوڑتی ہوئی آئی۔ مگر بابو جی نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ زمین پر گر گئی۔ ٹینا چاچا جی چاچا جی چلاتی رہی اور وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے حویلی لے گئے۔ اپنے ماتھے سے بہتے ہوئے خون کو بھول کر میں ماں کے پاس آ گیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا میں رونے لگا اور تبھی حویلی کے اندر سے دو آدمی آئے اور ہمیں کھینچتے ہوئے باہر نکال لائے۔

''ماں بڑے لوگ اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں کیوں مارتے ہیں؟''

ایک دوسرے کو سہارا دیتے گرتے پڑتے ہم اپنی جھونپڑی تک آئے۔ ماں کا بہتا خون رُک نہیں رہا تھا اور اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ میں وید جی کے گھر آیا۔ مگر وہاں تالا لگا تھا۔ چودھری کا کا کے پاس گیا مگر انہوں نے میری بات سنے بنا ہی مجھے بھگا دیا۔ اور میں تھک ہار کر واپس آ گیا۔ کا کی ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ ماں کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر بول نہیں پا رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ماں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ پتہ نہیں کس سہارے کی تلاش میں مَیں حویلی کی طرف بھاگا۔ چوکیدار نہیں تھا میں

اندر گھسا کہ سامنے ہی ٹینا کے چاچا جی کھڑے تھے۔

"سالے تو اب یہاں بھی......" غصے میں وہ میری طرف لپکے اور میں بھاگ نکلا۔ چوکیدار سے انہوں نے پتہ نہیں کیا کہا کہ وہ اپنا ڈنڈا گھماتے ہوئے میری طرف دوڑا اور میں بھاگتا چلا گیا۔ پتہ نہیں کس طرف...... یہاں تک کہ رات ہوگئی اور میں گر پڑا۔ سورج کی تیز گرمی مجھ پر پڑی تو میں اٹھا۔ میرے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ پتہ نہیں میں کہاں تھا۔ بھوک کا احساس کرتے ہی مجھے ماں یاد آگئی اور اس کی وہ کھلی ہوئی پھٹی آنکھیں...... ماں...... ماں...... اپنی تکلیف بھول کر میں پھر بھاگنے لگا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ چاروں طرف لمبی لمبی سڑک تھی۔ پتہ نہیں میں کہاں تھا اور ماں...... بے حال ہوکر میں سڑک پر گر گیا۔ کسی نے مجھے جگایا تو میں سہما ہوا سا کھڑا ہونے لگا۔ تبھی میری نظر اس کے جوتوں پر گئی۔ وہ چاچا جی جیسا بوٹ...... دیکھتے ہی میں بھاگنے کی کوشش کرنے لگا مگر پھر لڑکھڑا گیا اور وہیں گر گیا۔

"کیا بات ہے اس ویرانے میں تم اکیلے کیا کر رہے ہو۔" دھیمی آواز اور ملائم لہجہ سن کر میں نے سر اٹھایا۔

"مجھے بھوک لگی ہے اور پیاس بھی۔" میرے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

"ہم تمہیں کھانا بھی دیں گے اور پانی بھی آؤ۔" میرا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ مجھے اپنی جیپ تک لائے۔ کئی گلاس پانی اور پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد میرے آنسو اور تیز بہنے لگے۔

"کہاں جانا ہے۔" ان کے سوال پر میں کچھ نہیں بولا۔

"ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہم تم کو بہت سا کھانا دیں گے۔" انہوں نے کہا اور میں نے چپ چاپ سر ہلا دیا۔

مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی وہ جیپ ایک بڑے سے گھر میں داخل ہوگئی۔ بندوقوں سے لیس آدمی چاروں طرف دکھائی دیے۔ میں سہم سہم کر چل رہا تھا۔ تبھی ہم ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

"آج سے یہ کمرہ تمہارا ہے۔ تمہارا کام صرف کھانا اور کھیلنا ہے۔ جب چاہو جو چاہو

وہ تمہیں ملے گا یہ ہے گنگو۔ یہ تمہارا خیال رکھے گا۔'' انہوں نے گنگو سے کچھ کہا اور چلے گئے۔

اتنا بڑا کمرہ...... اتنا اچھا...... پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ جیسے کوئی جادوئی دنیا ہو۔ مگر یہ سب میرا تھا۔ میں کبھی ایک چیز چھوتا کبھی دوسری...... کبھی نرم بستر پر لیٹتا تو کبھی کرسی پر بیٹھتا اور پھر ڈرتے ڈرتے میں نے گنگو کو آواز دی۔

''جی چھوٹے صاحب۔'' وہ کسی جن کی طرح میرے سامنے تھا۔ میں گھبرا گیا مگر پھر میں نے ہمت کر کے اس سے کیک لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ بڑی سی پلیٹ میں کیک لے کر حاضر تھا۔ میں نے تھوڑا چکھا، بالکل ویسا ہی تھا گدگدا، جیسا ٹینا نے مجھے کھلایا تھا۔ پھر تو میں کھاتا ہی چلا گیا ہر وقت...... پتہ نہیں کیا کیا۔ ٹی وی دیکھتا فلمیں دیکھتا...... پھر ویڈیو گیم کھیلنا شروع کیا۔ پھر کمپیوٹر پر ہاتھ مارنے لگا۔ میرے ہر انداز میں ایک اسٹائل آ گیا اور میں انگریزی کے جملے آسانی سے بولنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا حلیہ ایسا تبدیل ہوا کہ باس بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔ میری ذہانت کو انہوں نے سراہا۔ اور پھر اپنے ساتھ کھڑے پنٹو سے کہا۔

''جمی کو کام پر لگاؤ۔''

''کام''...... سنتے ہی مجھے برسوں بعد حویلی کی یاد آ گئی۔ بھینسوں کو چارا دیتے بیرو اور ننددو...... سالا باس کا دماغ گھوم گیا تھا مجھے بہت ہنسی آئی۔ گھوڑ سواری کو وہ کام کہتا ہے یا پھر نشانہ بازی کو...... یا جوڈو کراٹے کی ٹریننگ کو۔ اچھے کھانے، ذہنی آزادی اور نئے فیشن کے کپڑوں نے مجھے ایک اچھے اور پُرکشش جسم کا مالک بنا دیا تو دوسری طرف پنٹو کی شاطرانہ چالوں نے میری ذہنیت ہی بدل دی۔ میری چال ڈھال میں ایک رعب تھا۔ آنکھوں میں ایک پیاس تھی جس میں ماں کی کھلی آنکھوں کی گرمی تھی۔ میں جب بھی نشانہ لگاتا تو میری آنکھوں کے سامنے ماں کی آنکھیں گھوم جاتیں اور سامنے چاچا جی کا خوفناک چہرہ آ جاتا اسی لیے میرا نشانہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک کامیاب کلر بن گیا۔ پنٹو میرے لیے سپاری لیتا تھا وہ ایک دن پہلے نوٹوں سے بھرا بیگ اور فائل لے کر آتا جس میں ساری تفصیل مع فوٹو کے ہوتی۔ اپنی ضرورت کے مطابق میں بیگ سے روپے نکال لیتا اور

بیگ باس کے حوالے کر دیتا۔اس میں کتنی رقم ہے یہ جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔اب تک میں سیکڑوں لوگوں کو موت کی گھاٹ اتار چکا تھا۔جس میں سماج کے اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ ہر قتل کے بعد ایک ہنگامہ ہوتا۔سیکورٹی بڑھا دی جاتی۔ پولیس قاتلوں کی تلاش میں زور شور سے لگ جاتی۔ کچھ لوگوں کو گرفتار کرتی اور میں ان سب سرگرمیوں سے دور کسی بار میں جشن مناتا...... یا پھر کسی دور دراز علاقے میں گھومنے چلا جاتا۔مگر کل پہلی بار میں اپنے مشن میں ناکام ہوا تھا۔اور اس ناکامی پر نادم ہونے کے بجائے پتہ نہیں کیوں میں بہت پرسکون تھا۔

''تم سو گئے تھے شاید'' مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ جلدی سے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں، مگر اٹھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میں برسوں سے سوتا رہا ہوں۔''

''تمہاری باتیں، بہت عجیب سی ہیں بابو جی میری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔''

''اب میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہیں سمجھ میں نہ آئے۔چلو گھومتے ہیں یہاں کا راستہ تو تم جانتی ہوگی۔''

''ہاں...... ہاں ندی کے اس پار سے اس پار تک میں سب جانتی ہوں چلو۔'' وہ آگے بڑھی۔

''تم کو میرے ساتھ ڈر نہیں لگے گا؟''

''ڈر کیسا۔اور پھر تم تو وہ ہو۔''

''وہ...... وہ کون؟'' میں چونکا۔

''موسی کے کہنے پر کل میں نے برت رکھا تھا۔دیوی کی پوجا بھی کی تھی اور پنڈت جی نے کہا تھا کہ کل تک مجھے بیاہنے کوئی نہ کوئی آجائے گا اور تم آ گئے...... لمبے چوڑے پاٹھ شالہ میں پڑھے......'' وہ شرمائی۔

''شہر میں نوکری کرتے ہو بابو جی؟''

''نہیں'' میرے منہ سے نکل گیا۔ ''کوئی بات نہیں ہمارے گاؤں میں تمہیں کام

مل جائے گا۔''

''وہی ہونا تم......'' مجھے خاموش دیکھ کر وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''ہاں — وہی ہوں میں۔'' میں نے اقرار کر لیا۔ تبھی موبائیل کی گھنٹی بجی۔

''کہو پنٹو کیا بات ہے؟'' نمبر دیکھ کر میں نے کہا۔

''کہاں ہیں آپ چھوٹے صاحب......کل کام ہونا تھا اور اب تک......''

''سپاری واپس کر دو'' اور میں نے موبائیل آف کر دیا۔

اور — وہ چار دن میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ مٹی کے چولھے پر بنی موٹی موٹی گرم روٹی چٹنی اور مرچوں والے پتلے سالن کے ساتھ کھانے میں شاید میرا بچپن پوشیدہ تھا۔ کھیتوں میں گھومتے ہوئے مجھے ماں کی خوشبو محسوس ہوتی اور دور تک پھیلا آکاش مجھے آزادی کا احساس دیتا۔ بادلوں کو پکڑنے کے لیے ہم دور تک بھاگتے جو ہمیں دیکھنے پر زمین سے قریب لگتا۔ مگر وہاں جا کر وہ اتنا ہی اونچا ہو جاتا۔ قدرت کا کتنا بڑا فریب ہے یہ......مگر اس فریب میں ہم بار بار آتے رہے اور اپنی بیوقوفی پر ہنستے رہے۔

موبائیل کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کان سے لگایا۔

''چھوکری سے دل بھر گیا ہو تو فوراً آ جاؤ۔ بہت سے کام نپٹانے ہیں۔'' باس کی آواز آئی۔ اور فون بند ہو گیا۔ میں گھبرایا مگر یہ وقت تو آنا ہی تھا......تارا میرے ساتھ تھی میرے لیے یہ سہارا ہی بہت تھا۔ دوسرے دن ہم ہیڈ کوارٹر آ گئے باس باہر گئے تھے۔ تارا یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ جن چیزوں کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا وہ سب ہماری دسترس میں تھیں۔ لکژری کار میں مَیں نے اسے سارا شہر گھمایا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں اس نے کھانا کھایا تو کبھی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گول گپے کھائے تھے۔ بڑی بڑی جویلری شاپ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں تو کپڑوں اور میک اپ کے انبار میں وہ گم ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر کھلی ہنسی میں مَیں خوش تھا کہ تارا کی بات نے مجھے الجھا دیا۔

''بابو جی! ہمیں واپس گاؤں بھیج دو۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''کیوں کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟'' میں چونکا۔

''ہم سے کوئی کیا کہے گا۔ مگر ہم تمہارے میل کے نہیں ہیں۔ تم تو بہت بڑے لوگ ہو۔ یہاں کے طور طریقے بھی ہمیں نہیں معلوم۔ گھبراہٹ ہوتی ہے ہمیں ان کمروں میں۔''
اور وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''دیکھو تارا تم یہاں جیسے رہنا چاہو رہو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب تمہارا ہے اور میرا اس دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ سمجھیں تم؟ تم چلی جاؤ گی تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔''

''کون کہاں جا رہا ہے؟'' باس کی کڑک دار آواز آئی تو تارا سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔
میں نے ہلکے سے اس کا ہاتھ دبایا اور باس کے ساتھ پرائیوٹ روم میں آ گیا۔

''اب تک اتنی لڑکیاں تمہاری زندگی میں آ چکی ہیں اس میں ایسی کیا بات دیکھی جو سب کچھ چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔''

''یہ فیصلہ تو خود بخود ہو گیا ہے۔'' میرے لہجے میں ایک یقین تھا اور باس کے ماتھے پر شکنیں کافی واضح تھیں۔

''ہم نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے تمہیں وہ سب دیا ہے جو بڑے سے بڑے آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ پھر یہ......''

''میں نے قیمت چکا دی ہے باس۔ اتنا پیسہ کمایا ہے کہ آپ......''

''وہ سب تمہارا ہے مگر تم اس لڑکی کی خاطر سب چھوڑ چھاڑ کر باقی زندگی نالی کے کیڑے کی طرح گزارنا چاہتے ہو۔ جبکہ یہاں یہ محل صرف تمہارا ہے۔''

''جب آسمان تنگ پڑ جائے تو واپس اپنی دھرتی پر لوٹ جانا چاہئے۔ وہی کر رہا ہوں۔''

''اوہ...... تو اس لڑکی نے تمہیں عاشق کے ساتھ ساتھ شاعر بھی بنا دیا۔''

''میں اپنی جڑوں سے اکھڑ گیا تھا۔ اس نے مجھے واپسی کا راستہ دکھایا ہے بس۔''

''مگر تم اس راستے پر چلو گے جو ہم تمہیں دکھائیں گے۔ یہ لو نئے معاملے کی ڈیل مسز جوشی سوشل ورکر ہے آج کل کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہے۔ کل اس کی پبلک میٹنگ ہے۔ مگر وہاں بولنے سے پہلے اس کو ہمیشہ کے لئے چپ کرنا ہے۔''

اس کام کو میں نے چھوڑ دیا تھا اور اب اس جگہ کو بھی چھوڑنا تھا۔ میرا فیصلہ اٹل تھا۔ بہت خاموشی سے میں نے یہاں سے نکلنے کی تیاری مکمل کی۔ کچھ ضروری کام نمٹانے تھے میں تارا کو تیار رہنے کا کہہ کر باہر نکلا۔ مسز جوشی کے ویلکم میں پورا شہر پوسٹر اور بینر سے بھرا تھا۔ سیکورٹی بھی سخت تھی۔ مجھے لوٹنے میں دیر ہوگئی کہیں باس سے سامنا نا ہو جائے...... یہ خیال بھی پریشان کن تھا۔ شکر تھا چاروں طرف خاموشی تھی۔ تارا کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے آواز دی...... ادھر ادھر تلاش کیا...... کہاں جاسکتی ہے...... اکیلی؟ گنگو کو آواز دیتے ہوئے میں باہر نکلا۔ مگر نئے دربان نے لاعلمی ظاہر کی۔ میرا دماغ کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔ کیا تارا کو...... میں نے باس کو فون ملایا مگر وہ آف تھا۔ کیا تارا کی خاطر مجھے مسز جوشی کو ختم کر دینا چاہئے...... ہاں...... نہیں کی تکرار میرے اندر جاری تھی اور میرے ہاتھ مستقل فون کا نمبر دبا رہے تھے۔ باس، پنٹو، ٹونی اور گنگو سب کے فون بند تھے۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

''چھوٹے صاحب ...... مسز جوشی کو مار دیا گیا۔'' پھولی سانسوں کے بیچ نئے دربان نے اطلاع دی۔

''کیا...... کون مار سکتا ہے مسز جوشی کو'' ...... باس پنٹو یا پھر ٹونی میں سے کوئی اتنی سخت سیکورٹی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ پھر......؟ میں نے ٹی وی آن کیا۔

''مسز جوشی کے قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ پبلک میٹنگ کو اڈریس کرنے کے لئے وہ جیسے ہی گاڑی سے اتریں...... ایک تیز دھماکے نے پوری فضاء کو اپنے اندر سمولیا۔ خیال کیا جارہا ہے کہ......'' میں دم سادھے خبر سن رہا تھا تبھی کیپشن میں مسز جوشی کی طرف بڑھتی ہوئی ایک جھلک تارا کی نظر آئی۔ ''تارا......'' میں لرز اٹھا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ باس اور چاچا جی کی تصویریں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ میرا گھروندا ایک بار پھر اجڑ گیا تھا۔ کاریڈور سے باس اور ساتھیوں کی آواز آئی اور میرا ہاتھ خود بہ خود شرٹ کے نیچے چلا گیا۔

اور ـــــ

اور اس وقت میں نے جانا جب جب گھروندے ٹوٹتے ہیں تب تب ایک دہشت گرد جنم لیتا ہے۔

☆☆

آئینہ چُپ ہے

''حاجی برکت علی شاہ کو پولیس لے جا رہی ہے'' آناً فاناً یہ خبر پورے قصبے میں پھیل گئی۔

بارہ تیرہ سال کے گلو نے تیزی سے برکت شاہ کے گھر کا دروازہ کھولا اور آنگن میں بھنڈی کاٹتی ان کی بیوی کو یہ خبر پھولی سانسوں کے درمیان سنائی۔

''کیا شاہ جی کو پولیس لے جا رہی ہے؟'' چاقو اور بھنڈی چھوڑتے ہوئے ایک ٹانگ سے معذور رحمت بی بی نے کھڑے ہونے کی کوشش میں گر کر سنبھلتے ہوئے دہرایا ان کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر نل کے پاس بنے حوض میں برتن دھوتے ہوئے شاہ جی کی دوسری بیوی نوران ہاتھ پونچھتے ہوئے آئیں۔

''کیا ہوا باجی۔''

''شاہ جی کو پولیس لے جا رہی ہے۔'' ان کے بجائے اس بچے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

''ہائے ...... لیکن کیوں......'' مگر اس سے پہلے کہ اس کیوں کا کوئی جواب ملتا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور چھ سات پولیس والے ایک ساتھ داخل ہوئے۔

''برکت شاہ کی گھر والی'' ایک لمبا چوڑا اوردی والا سامنے کھڑا تھا برکت بی بی نے آنچل اور نیچے سرکایا اور نورن کانپتے ہوئے ان کے پاس سرکتی ہوئی بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''تلاشی لینا ہے۔ یہ ہیں کاغذات۔'' ایک پرچہ ان کے سامنے لہرایا۔ پتہ نہیں کیا لکھا تھا انگریزی تھی شاید۔ دونوں نے ایک نظر کاغذ پر اور افسر پر ڈالی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا اور وہ چاروں طرف پھیل گئے۔ تھا ہی کتنا بڑا یہ گھر آنگن کے بعد دالان اور وہیں سے دو دروازے جو دونوں کمروں کے لیے تھے۔ دالان میں بنی الماری پر نورن کے سلیقے سے سلے پردے کو پولیس والے نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس طرح کھینچا کہ وہ کیل سمیت نیچے آ گیا۔ اس میں ایک طرف رحمت بی کا بنایا ہوا آم اور مرچوں کا اچار تھا۔ اوپر کے خانے میں نورن بی کے جہیز کا کپ اور پلیٹ کا سٹ مع ایک ٹرے کے سجا ہوا تھا جو ان کے ماموں نے انہیں دیا تھا۔ مہمانوں کے آنے پر وہ خاص اہتمام کے ساتھ اس کو نکالتیں اور گھنٹوں دھونے اور سکھانے کے بعد اسی کو اپنی جگہ رکھ دیتیں۔ شکر تھا کہ پولیس والے نے اسے نہیں چھوا۔ اور اب وہ نچلے خانے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں ایک طرف پان کا سوکھا سامان اور دوسری طرف کچھ کتابیں اور ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈائری کھولی۔ اسے الٹا پلٹا پھر آنگن میں کھڑے اپنے افسر سے کچھ کہا۔ اس نے وہ ڈائری تھام لی۔ باقی پولیس والے کمرے میں اب بھی مصروف تھے۔ بڑی سی سنگھار میز کھسکانے کی آواز آئی۔ ہول کے مارے رحمت بی نے ایک بار پھر بے ساختگی سے کھڑی ہونے کی کوشش کی اور پھر ڈگمگاتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

دو گھنٹے کی اٹھا پٹخ کے بعد کاغذات کا پلندہ سنبھالے وہ سب رخصت ہو گئے۔ اور ان کا گھر آس پاس کے لوگوں سے بھر گیا۔

''دہلی سے خاص پولیس آئی تھی شاہ جی کو پکڑنے......'' سب کی زبان پر یہ جملہ تھا۔ کس جرم میں......اس کا علم ٹھیک سے کسی کو نہیں تھا۔

نورن کا سہارا لے کر رحمت بی دھیرے دھیرے دالان تک آئیں۔ غم سے نڈھال

چہرے پر مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دل کا غبار زبان سے بھی نکل رہا تھا۔

''......یہ دن بھی دیکھنا لکھا تھا نصیب میں......ارے پولیس تو اب تک چور اچکوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو لے جاتی تھی......شاہ جی کے پیچھے کیوں پڑ گئی۔''

سارا کمرہ تہس نہس ہو رہا تھا۔ کھلے بکس اور بکھرے ہوئے کپڑے......کمرے کے بیچوں بیچ اس گھر کی واحد قیمتی اور رحمت بی بی کی عزیز شے سنگھار میز کھڑی تھی۔ وہ گھومیں۔ سنگھار میز کے آئینے میں شاہ جی کی تصویر لمحے بھر کے لیے جھلملائی۔ ''شاہ جی۔'' وہ جیسے پکڑنے کو لپکیں مگر تصویر غائب ہو گئی۔ برسوں گزر گئے۔ اس آئینے میں ان کے ابا مرحوم کی تصویر برسوں تک جھلملاتی رہی اور وہ انہیں پکڑنے کے لیے دوڑتی رہیں۔ ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے۔ جب ابا حضور نے اس سنگھار میز کو بڑے جج صاحب سے خریدا تھا اور روزانہ کچہری جانے کے لیے گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تیار ہوتے۔ اور نکلتے وقت بھی کاغذوں کی فائل لیے اپنا دیدار کرتے اور پھر جاتے۔ اچھے بھلے ابا پر ایک رات فالج کا زبردست حملہ ہوا۔ اور وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ پولیو کی شکار رحمت بی پر ساری ذمّے داری آن پڑی۔ ایسے میں سدا کے سیدھے سادھے برکت علی جو کچہری کے کام میں ابا کی مدد کرتے تھے اب گھر کا کام کاج بھی دیکھنے لگے۔ ابا نے ان سے پتہ نہیں کیا کہا کہ دوسرے دن وہ قاضی کو لے کر آ گئے اور رحمت بی ان کے نکاح میں آ گئیں۔ برکت علی جو اس سے پہلے کنڈی بجا کر اور آواز دے کر اندر آتے تھے اب بے دھڑک گھر میں آنے لگے اور اکثر باورچی خانے میں چائے دم کر لیتے یا چیزوں کو رکھنے اٹھانے میں رحمت بی کی مدد کرنے لگے۔ ابا حضور کے والد کی بنوائی مسجد کا ایک کمرہ جو اب تک ان کا مسکن تھا اسے خالی کر کے وہ اپنے سامان سمیت دالان کے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ مسجد کے اس کمرے میں دو غریب لڑکے آ کر رہنے لگے جن کی کفالت ابا حضور نے اپنے ذمّے لے لی۔ مسجد کے ایک کونے میں برکت علی نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا جہاں کلام پاک کے ساتھ ساتھ دوسری دینی کتابیں بھی پڑھائی جاتیں— آس پاس کوئی اسکول نہیں تھا اس لیے دھیرے دھیرے مدرسہ چل نکلا۔ گھر کے آنگن کو مدرسے سے ملا کر کئی کمرے بن گئے۔

ابا نے اپنی تمام جمع پونجی اس کام میں صرف کردی۔ اور برکت علی کو مدرسے کا صدر مدرس بنا دیا اور وہیں کے پڑھے ان دونوں لڑکوں کو مدرس کی ذمے داری سونپ دی اور اسی رات چپ چاپ انہوں نے اپنی زندگی کا سفر تمام کیا۔ رحمت بی اس اچانک حادثے سے بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ برکت علی ان کی خدمت کرتے۔ کھانا پکاتے اور باقی وقت مدرسے کی دیکھ بھال میں گزارتے۔ مگر گھر اور مدرسے کے کام کاج میں تال میل بٹھانا مشکل ہوتا گیا۔ انہیں دونوں رحمت بی کے ایک دور کے رشتے دار اپنی نوعمری میں بیوہ بھانجی نورن کو لے کر آگئے اور رحمت بی کے پاس چھوڑ کر ایسے غائب ہوئے کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ رحمت بی کی مرضی سے برکت علی نے نورن سے نکاح کرلیا اور زندگی میں توازن قائم ہو گیا۔ نورن نے گھر کا کام کاج تو سنبھالا ہی، ساتھ ہی رحمت بی کی ذمے داری بھی لے لی اور وہ کچھ حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہو سکیں۔ برکت علی اب زیادہ وقت مدرسے کی ترقی میں دینے لگے۔ چندہ جمع ہوا، تعمیری کام ہوا۔ طلباء کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی آس پاس کی جگہوں میں مدرسے کی شہرت ہوگئی۔ گاؤں کے چودھری نے اپنی بیمار ماں کے بدلے برکت علی کو حج پر بھیج دیا اور وہ برکت علی سے حاجی برکت علی شاہ عرف شاہ جی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ رہنے والے لڑکوں کی کفالت مدرسہ خود کر رہا تھا اس لیے بہت سے غریب والدین کھانے پینے کا لالچ دے کر بچوں کو مدرسے میں داخل کر دیتے۔ شاہ جی کے گھر ان بچوں کو آنے جانے کی آزادی تھی۔ رحمت بی کا دل ان میں لگا رہتا اور نورن کو سودا سلف منگانے کی آسانی ہوگئی۔ صبح شام لمبا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیے مولوی صاحب بچوں کو ناظرہ پڑھاتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چھڑی بھی گھماتے جاتے، بڑے لڑکوں کے لیے باقاعدہ کلاس تھی۔ جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی دی جا رہی تھی اور باقاعدہ سرکاری منظوری ملنے پر بورڈ سے امتحانات ہونے لگے۔

رحمت بی جب بھی کسی سے مدرسے کی تعریف سنتیں وہ آئینہ کے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔ جہاں ان کے والد کا بارعب چہرہ جھلملاتا اور وہ دوپٹے کے کونے سے شیشے کی دھول صاف کرنے لگتیں۔ مگر آج...... ان کے باپ کے لگائے پودے اور شاہ جی کے خون پسینے

سے سینچے ہوئے اس درخت کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ پتہ نہیں ان کی آنکھوں میں کچرا تھا یا پھر آئینے پر اتنی گرد تھی کہ وہاں کسی کی شبیہہ نظر نہیں آئی اور وہ گھبرا کر نورن کا ہاتھ پکڑے باہر نکلیں اور دروازے تک آگئیں۔ باہر جھانکا، مدرسے کے صدر دروازے پر بڑا سا تالا لٹک رہا تھا اور ایک پولیس والا تعینات تھا۔ مدرسے کے تمام بچے باہر ہی کھڑے تھے جبھی مدرس کے ساتھ گاؤں کے چودھری آئے۔

''پولیس کو شبہ ہے کہ یہاں پڑھنے والوں کو دہشت گردی اور اسلحہ بنانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں پوچھ تاچھ کرنے کے لئے پولیس شاہ جی کو دہلی لے گئی ہے۔ تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہی مدرسہ کھولنے پر فیصلہ ہوگا۔''

رحمت بی اور نورن نے آنگن میں کھڑے بچوں کو دیکھا جو خاموش زبان میں ان سے پوچھ رہے تھے کہ اب ہم کہاں جائیں مگر ان سوالوں کا دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ دھیرے دھیرے دالان میں آئیں۔ دروازے سے سنگھار میز کی طرف دیکھا۔ مگر آئینہ میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

کیا خاموشی کی زبان سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ چاروں طرف آواز گردش کر رہی تھی۔

اسپرنگ

جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دل عجیب انداز سے دھڑکا۔ یہ صبا کا تصور ہی تھا جو ست رنگی رنگوں میں رنگا چاروں طرف بکھر رہا تھا۔ کیسی ہوگی وہ...... ویسی ہی...... چنچل شوخ...... نٹ کھٹ...... ذراسی دیر میں روٹھ جانے والی اور پھر خود بخود خوش ہوجانے والی ...... بیوقوف لڑکی...... ہاں شاید ویسی ہی...... جیسی چھ سال پہلے چھوڑ کر میں یہ سیڑھیاں چڑھا تھا۔ اس وقت اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کپکپاتے ہونٹوں پر چند الفاظ تھے...... جنہیں وہ سن نہیں سکا تھا...... یا شاید اس نے کہا بھی نہیں تھا۔ دھڑکتے دلوں میں گھبراہٹ اور بچھڑ جانے کا خوف تھا، مچلتی آرزوؤں میں کچھ خواب تھے مگر ان سب سے بڑھ کر ان کے بیچ امید کے دیے تھے...... جو صبا نے اس کے ساتھ کردیے تھے مگر گزرتے وقت کے ساتھ امریکہ کی تیز رفتار زندگی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ دیے تو دیے ہوتے ہیں جو آندھی کیا ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ سکتے ہیں اور بجھ جائے تو اسے دوبارہ جلایا بھی جاسکتا ہے اور صبا وہ تو اتنی معصوم اور بھولی ہے کہ اس کو دیکھ کر ہی سب گلے شکوے بھول جائے گی اور سوالوں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے سے پہلے ہی وہ بری ہوجائے گا۔ نہ صفائی دینے کی ضرورت اور نہ ہی دیے بجھنے کی وجوہات پر استفسار۔ لڑکیاں واقعی بے وقوف ہوتی ہیں۔ ایسا میرا گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہے اور اگر نہ ہوں تو ہم جیسے مرد بغیر کسی ریاضت کے

ولی نہ بن جائیں۔ مسکراہٹ کا ایک تیر پھینکے اور وہ موتی بن کر جھولی میں ٹپک پڑیں گی۔

گوری چمڑی اور نیلی نیلی آنکھوں والی جولیا کو میں پہچان ہی نہیں سکا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔ ہماری پہلی ملاقات لفٹ میں ہوئی تھی۔ امریکن خوش مزاج ہوتے ہیں۔ لفٹ میں بس ہم دونوں ہی تھے۔ میں نے ہیلو کہا وہ مسکرائی اور رسمی بات چیت شروع ہوگئی۔ جس نوکری کے لیے انٹرویو دینے میں آیا تھا اسی کے لیے وہ بھی آئی تھی۔ عین وقت پر انٹرویو ملتوی ہوگیا۔ نوکری کی مجھے ہر حال میں ضرورت تھی۔ میری اتری ہوئی اداس صورت دیکھ کر اسے مجھ پر رحم آگیا اور وہ میری مدد کے لیے فوراً تیار ہوگئی اور ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں مجھے نوکری مل گئی۔

''کام تو کام ہوتا ہے۔ اس میں اچھا کیا اور برا کیا۔ ایک نہ ایک دن تمہاری اہلیت کے مطابق تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی Now cheer up'' میرے بالوں کو بگاڑتے ہوئے اس نے کہا اور مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کافی پلانے لے آئی۔

نوکری تو مل گئی۔ اصل پریشانی ختم ہوتے ویزے کی تھی مگر اب اس کے بھی دور ہونے کے چانسز سامنے تھے۔ شادی...... میں خوش ہوگیا اور جولیا کو شیشے میں اتارنے کی پلاننگ کرتا رہا...... مگر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی...... لڑکیاں کہیں کی بھی ہوں...... سمندر کے اس پار کی یا اس پار کی...... بیوقوف ہی ہوتی ہیں۔ جولیا میری جھولی میں خود بہ خود ٹپک پڑی۔ وہ emotionally بہت insecure تھی۔ اپنی نانی کے ساتھ رہتی تھی۔ گھر تو چھوٹا تھا مگر امریکہ جیسے ملک میں بغیر کسی محنت کے ملنے والا یہ گھر مجھے وہائٹ ہاؤس نظر آرہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ بس پرابلم کہیں تھی تو جولیا کی نانی۔ مگر ان کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ سال دو سال سے زیادہ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گی اور میرا خیال اس وقت یقین میں بدل گیا جب مجھے پتہ چلا کہ وہ میٹھے کی شوقین ہیں اور Diabetes کی مریض۔ اوپر والا واقعی مجھ پر مہربان تھا۔

''میں شادی اسی لڑکے سے کروں گی جو نانی کو پسند آئے گا۔'' مجھے لگا وہ اشاروں میں مجھے کچھ سمجھا رہی ہے۔

''اب گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔'' میں نے خود کو تسلی دی۔

آفس کے بعد میں جولیا کے گھر آجاتا اور اس کی نانی کی دلداری میں لگ جاتا۔ وہ بے تکان بولنے کی عادی تھیں اور میں بہت سنجیدگی اور دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سنتا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے چائے بناتا۔ یہ اور بات تھی کہ میں چائے میں Sugar free کے بجائے چینی ڈال دیتا اور چائے پینے کے دوران ان کو باتوں میں الجھائے رکھتا۔

اور جولیا...... امریکہ جیسے آزاد اور ترقی یافتہ ملک کی پیداوار ہو کر بھی مجھے اکثر صبا کی یاد دلا جاتی۔ بظاہر دونوں مختلف تھیں مگر اندر سے اس حد تک مماثلت تھی کہ میں اکثر حیران رہ جاتا۔ بس فرق تھا تو اتنا کہ صبا بہت آسانی سے میرے رعب میں آجاتی۔ کبھی کبھی تو میں بس خاموش ہو کر اسے قائل کر لیتا مگر دوسری طرف جولیا تھی۔ پر اعتماد اور بولڈ۔ اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کا ڈھنگ اسے آتا تھا۔ شروع میں مجھے دقت آئی۔ اپنی عادت کے مطابق ایک دو بار اس کی صحیح بات کو میں نے تیز آواز میں اور چلا کر جھٹلانا چاہا۔ کیونکہ ایسا کرتے ہوئے میں نے صرف اپنے باپ کو ہی نہیں بلکہ آس پاس کے مردوں کو بھی دیکھا تھا۔ ہماری فلموں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

مگر اس نے مجھ سے بھی زیادہ خطرناک لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

"Don't shout and don't be unreasonable."

میری مردانگی کو ٹھیس پہنچی مگر دوسرے ہی پل گوری چمڑی اور نیلی نیلی آنکھوں والی جولیا کے ساتھ ویزے کے کاغذات مع گھر کے میرے سامنے لہرائے۔

''تم ناراض ہو گئیں میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' میں نے برسوں پرانا گھسا پٹا جملہ دہرایا۔

"you are impossible." وہ ہنسی۔

مگر impossible تو وہ تھی۔ میرا مقصد صاف تھا۔ جولیا سے جلد از جلد شادی کر کے Green Card کے لیے اپلائی کرنا اور ایک بار میں یہاں establish ہو جاؤں تو پھر جولیا کو میرے ساتھ میری مرضی کے مطابق رہنا ہوگا۔ ورنہ صبا تو ہے ہی...... اپنے حالات بتا کر اسے منالوں گا اور ویسے بھی میرا انتظار کرتے کرتے وہ اتنا تھک چکی ہوگی کہ

مزید سوال کرنے کی ہمت ہی اس کے پاس نہیں بچے گی۔

اس دن نانی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جولیا نے مجھے فون کر کے بلایا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے جولیا کو مستقبل کے اس خطرناک پہلو سے آگاہ کیا جب نانی اچانک کسی دن اس بھری دنیا میں اسے تنہا چھوڑ جائیں گی۔ مگر میں ہمیشہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہوں گا۔ گیلی گیلی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اس نے میری پیش کش قبول کرلی۔ مگر اس کے پلان سن کر میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

”Spirituality (روحانیت) مجھے ہمیشہ سے پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ روحانیت میں جو سکون آسودگی اور قناعت ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔ اس مادی زندگی سے میں اکتا چکی ہوں۔ وحشت ہوتی ہے مجھے اس تیز رفتار زندگی سے۔ جہاں ہم خود ایک مشین بن چکے ہیں، کوئی احساس نہیں۔ نہ خوشی کا نہ غم کا، گھڑی کے اردگرد چکر لگاتی اس زندگی میں کتنا کھوکھلا پن ہے تم نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا مگر میں تو جیسے کسی اندھے کنوئیں میں پھنسا زندگی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور وہ میری حالت سے بے خبر اپنے خواب سنا رہی تھی۔

”ہم انڈیا چلیں گے، کسی چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے، جہاں ہماری چھت ہوگی ہمارا آسمان ہوگا۔ ساری دنیا ہماری ہوگی۔ یہاں سے وہاں تک زمین بھی ہماری اور آسمان بھی ہمارا۔ سکون ہی سکون ہوگا۔ ہر فکر اور ہر غم سے آزاد ہم ہوں گے اور ہماری دنیا۔“

آنکھیں بند کیے ہاتھ پھیلائے وہ کسی بچے کے انداز میں بول رہی تھی۔ خوشیاں ...... پتا نہیں کن خوشیوں کی بات وہ کر رہی تھی...... غریبی سے تنگ آ کر میرے باپ نے شہر میں پناہ لی تھی اور مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کی تمنا کی تھی اور اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں امریکہ تک آ گیا تھا۔ چار سال کی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے جگہ جگہ نوکری کی تھی۔ ویزے کی خاطر صبا کو بھلا کر جولیا کو ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور خود کو establish کرنا آسان لگنے لگا۔ مگر اب...... ویزا ختم ہونے میں ایک مہینہ سے کم وقت تھا...... میرا سر گھومنے لگا۔ خوشی اور اچھی زندگی کی تلاش میں لوگ امریکہ آتے ہیں اور اسے پانے کے

لیے وہ انڈیا جانا چاہتی ہے۔ بیوقوف لڑکی...... بارش کے دنوں میں ٹپکتی چھت کے نیچے سکون تلاش کرے گی...... اے سی کو ٹھکرا کر چلچلاتی دوپہر میں پانی کی تلاش میں وہ رومانس ڈھونڈے گی۔ اپنے سپنوں کا تاج محل مجھے ڈھیر ہوتا ہوا صاف نظر آرہا تھا مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں اسے سنجیدگی سے سمجھاؤں۔

''جولیا تم ایک ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوئی ہو۔ جن چیزوں کا ہم تصور کرتے ہیں وہ تمہیں بغیر کسی کوشش کے بغیر مانگے حاصل ہو جاتی ہیں اس لیے تمہاری نظر میں وہ بے مول ہے۔ ورنہ......''

''یہی نقطہ ہے جو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں، احساس دلانا چاہتی ہوں، ترقی اور آگے بڑھنے کی خواہش ایک جنون کی طرح ہوتی ہے۔ تم اس میں پھنستے چلے جاؤ گے اور کہیں کوئی سرا نظر نہیں آئے گا۔ جانتے ہو میری ماں نے میرے باپ سے رشتہ جوڑا تھا اپنا ماڈلنگ کیریئر بنانے کے لیے اور مجھے چھوڑ کر اس لیے چلی گئی کہ میں اس کے کیریئر کی رکاوٹ تھی۔ نفرت ہے مجھے ایسی ترقی سے، ایسی رفتار سے اور......''

''مگر میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔ ہمیں کچھ دن یہیں رہنا ہوگا۔ بعد میں......''

''یعنی شادی کرنے کا مقصد تمہارے لیے صرف ویزا پانا ہے۔ ایک بار تم کو گرین کارڈ مل جائے اس کے بعد تم......''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ کچھ دن بعد۔''

''کچھ نہیں ہوگا کچھ دن بعد۔ تم میرا پیچھا صرف ویزے کی خاطر کر رہے ہو۔''

''میں پیچھا کر رہا ہوں تمہارا؟ ہم لفٹ میں اتفاق سے ملے تھے۔''

''ملے اتفاق سے تھے مگر اب کچھ بھی اتفاق نہیں بلکہ پلاننگ ہے تمہاری۔ جس کے لیے تم کسی حد تک جا سکتے ہو۔''

''Shut up جولیا۔!''

''ارے جس کی دو باتیں تم نہیں سن سکتے ہو۔ اس کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کا خواب دیکھ رہے ہو۔''

اور...... بس یہ میرے صبر کی انتہا تھی۔ میں نے جولیا کا غصہ جھیلا تھا اس کی نانی کی بکواس پر سر ہلایا تھا۔ مگر اپنے ضمیر پر چوٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے میں جولیا تو کیا کچھ بھی چھوڑ سکتا تھا۔

عجلت اور بغیر کسی تیاری کے امریکہ چھوڑنا مجھے بہت کھل رہا تھا۔ جولیا کو جتنی گالیاں میں دے سکتا تھا میں نے دیں۔ مگر اس کا کانوں میں گونجتا ایک جملہ میرے تن بدن میں آگ لگانے کے لیے کافی تھا اور یہ آگ صرف صباؔ ہی بجھا سکتی تھی۔ اس کا فون نمبر شاید بدل چکا تھا۔ ایک ساتھ تین چار خط میں نے اس اصرار کے ساتھ پوسٹ کیے کہ وہ وقت پر ایئرپورٹ پر موجود رہے۔

لاؤنج سے اس کی ایک جھلک دیکھ کر میرے تن میں لگی آگ دھیمی پڑنے لگی اور میں اطمینان سے چیکنگ کے مراحل پورے کرتا رہا۔

خوش مزاجی صبا کا اثاثہ تھی جس کا اظہار وہ اب بھی کر رہی تھی یعنی ناراض نہیں ہے۔ مجھے اطمینان ہوا۔

''تم تو بالکل نہیں بدلیں صبا۔'' میں روانی میں بول پڑا۔

''بدلے تو تم بھی نہیں۔ تمہارے چار خط ملے اس تاکید کے ساتھ کہ میں ایئرپورٹ لینے آؤں۔ حالانکہ آج کالج میں بہت ضروری میٹنگ تھی اور مجھے چھٹی لینی پڑی۔''

احسان جتانے کی عادت بھی اس کی پرانی تھی۔

''کالج میں لیکچرار ہو۔ جبھی چشمہ لگ گیا۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' باہر جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔

''گھر۔''

''مگر گھر تو ادھر......''

''اب وہ گھر تو چھوڑنا ہی تھا پھر یہ کالج کے قریب ہے اور تمام آسانیاں بھی ہیں۔''

صاف شفاف نفاست اور سادگی کا نمونہ بنا وہ گھر ایک عجیب سی آسودگی اور سکون اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ جولیاؔ شاید ایسے ہی سکون کی تلاش میں تھی۔ اتنے دنوں کے بعد پتا

نہیں کہاں سے اس کا خیال بغیر کسی تلخی کے میرے اندر آیا۔ سکون واقعی اپنے ملک، اپنی جگہ اور اپنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جہاں کی چھت بھی اپنی اور زمین بھی ہماری۔ دل ہی دل میں میں نے جولیا کا شکریہ ادا کیا۔

''کافی پیو، تم تھک گئے ہو گے۔ کھانا جاوید کے آنے پر کھائیں گے۔''

''جاوید۔''

''میرے شوہر۔ تم نے خط و کتابت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ کبھی فون بھی نہیں کیا۔ اس لیے تمہیں پتا نہیں چل سکا۔ میرے کالج میں ہی ہیں وہ۔ بس آتے ہوں گے۔'' گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

دھماکے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔

''صبا تم...... میرا انتظار کرنے کے بجائے ایک نئی دنیا نئے انسان کے ساتھ بسالی۔ یہ تماشہ دکھا کر تم کیا جتانا چاہ رہی ہو۔ غلطی کی میں نے یہاں واپس آ کر۔''

''غصے کو کنٹرول کرنا تمہیں آج بھی نہیں آیا اور ویسے بھی میں تمہیں کچھ جتانا نہیں چاہ رہی ہوں۔ یہاں آئے ہو تم اپنی مرضی سے۔ میں تو یہ سوچ کر تمہیں لینے گئی تھی کہ تم جولیا کے ساتھ آ رہے ہو اور مجھے اس سے ملوا کر......''

''جولیا...... کون جولیا۔ بے وقوف ہو تم جو دوسروں کی باتوں میں آ گئیں۔''

''ایکٹنگ مت کرو۔ امریکہ سات سمندر پار ضرور ہو گا مگر موسم کا حال جاننے میں سات منٹ بھی نہیں لگتا۔ ویسے آدھے راستے ساتھ چل کر چھوڑ دینا تمہاری پرانی عادت ہے۔''

اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی۔ جو کام جولیا کے جملے نے کیا تھا وہی تاثر اس کی مسکراہٹ میں تھا۔ کیا فرق ہے دونوں میں میں واپس مڑا۔

ایک منٹ۔ لڑکیاں بے وقوف نہیں ہوتیں صرف جذباتی ہوتی ہیں۔ اس لیے دماغ کے بجائے دل کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اور بے وقوف کہلاتی ہیں۔ مگر جب جب دماغ استعمال کرتی ہیں تو اسپرنگ کی طرح ہٹ کرتی ہیں۔ اسپرنگ تو دیکھی ہو گی آپ سب نے۔

☆☆

چاند میرا ہے

''دو کلو آلو اور...... آدھا کلو ٹماٹر دینا بھیا۔ ٹماٹر لال ہوں۔ مگر زیادہ گلے ہوئے نا ہوں...... ارے مٹر پھلی آ گئی۔'' میرے تھیلے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اچنبھے سے کہا تو مجھے احساس ہوا کہ اس سیزن میں فریش مٹر میں بھی پہلی بار خرید رہی ہوں۔

''مہنگی ہو گی کیا بھاؤ ہے۔'' ایک پھلی چھیل کر اس کا دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ بولی۔

''بارہ روپے کی ڈھائی سو گرام۔'' ٹماٹر تولتے ہوئے سبزی والا بولا۔

''اس کا مطلب ہے ۴۸ روپے کلو، باپ رے باپ۔''

ایک پختہ ریاضی داں ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ کچھ اس انداز سے بولی کہ میں شرمندہ ہو گئی۔

''بچوں کو مٹر پلاؤ بہت پسند ہے اور ان کو بھی، مگر مہنگی کچھ زیادہ ہے۔'' میرے تھیلے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا میں کیا کہتی میں نے تو بس بغیر کچھ سوچے سمجھے خرید لیا تھا۔۔ یہ بھی خیال نہیں کہ پہلی بار خرید رہی ہوں۔ ویسے مٹر پلاؤ ہی ٹھیک رہے گا میں نے بے دلی سے مینو بنایا۔

''کیا کرتے ہیں آپ کے مسٹر۔'' میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے پوچھا۔ میں گڑبڑا گئی۔ مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ شاید میرے مٹر پھلی خریدنے سے وہ مرعوب تھی۔

''میں ایک کمپنی میں فائنانس ایڈوائزر ہوں۔ دو دن پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئی ہوں۔ بی ۲۲ فلیٹ میں نرملا پانڈے۔''

''آپ۔''

''میں'' ابھی تک فراٹے سے بولتے رہنے کے بعد وہ کچھ ہچکچائی۔

''مسز گپتا۔ میرے شوہر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں پرچیز انچارج ہیں۔ ایم بی اے کرنے کے بعد چار سال وہ انگلینڈ میں بھی رہے ہیں۔ ہم یہاں پانچ سال سے رہ رہے ہیں۔ اے۔ ۲۴۔ وہ ہے ہمارا فلیٹ۔'' انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے دکھایا۔

''چلئے پڑوسی ہیں ملاقات ہوتی رہے گی۔'' میں خوش دلی سے بولی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، کوئی بھی پریشانی ہو تو بتایئے گا یہاں رہنے والے سب ہی بہت اچھے ہیں بس وہ بی۔ ۲، والی ذرا نک چڑھی ہے۔ نئی نئی گاڑی لی ہے نا اور چوبیس نمبر والے شرما جی، وہ لوگ تو اچھے ہیں، مگر ان کا بیٹا روہن بے حد شریر ہے۔ جان بوجھ کر ہماری کھڑکی پر بال پھینکتا ہے۔''

''آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، بہت دلچسپ ہیں آپ، مجھے کچھ کام......'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے بھی ابھی لنچ بنانا ہے۔ ماسی سارا کام کر جاتی ہے، مگر کھانا وہ میرے ہاتھ کا ہی کھاتے ہیں۔ بچوں کے اسکول کا ٹائم ہو رہا ہے اور ہمارے مسٹر...... ان کا تو کوئی وقت ہی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے ساری کمپنی انہیں کے بھروسے چلتی ہے۔''

اف...... کیا عورت ہے۔ دماغ خالی کر کے رکھ دیا۔

''بی بی جی اب میں جاؤں۔'' ماسی نے مجھے گھر میں گھستے دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... ہاں جاؤ اور سنو یہ مٹر پھلی لیتی جاؤ بچوں کے لیے مٹر پلاؤ بنا لینا۔''

میرے اطمینان سے کہنے کے باوجود اس نے جھجکتے ہوئے تھیلا اٹھایا اور ایک بار

پھر میری طرف دیکھا۔

فریش ہو کر میں کھانے کی میز پر آئی تو سانولی سی رنگت، تیکھے نین نقش اور نازک سے سراپا کے ساتھ بالوں کو لاپروائی سے بینڈ میں کسے، سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کرتی اور بے تکان بولنے کی عادی..... مسز گپتا میرے سامنے آ گئیں۔

مالی سال ختم ہونے والا تھا۔ مجھے آفس میں اکثر دیر ہو جاتی، آج بھی سات بج گئے تھے۔ سامنے بنے پارک میں مسز گپتا بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپکیں میں بھی رک گئی۔

''انجوائے کیا جا رہا ہے۔''

''جی نہیں انتظار کیا جا رہا ہے۔ ٹنکو نے اپنے پاپا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آج آئس کریم کھلانے لے جائیں گے۔ دیکھئے کتنی دیر ہو گئی۔''

''کوئی کام ہو گا۔''

''ان کو تو ہر روز کام رہتا ہے۔'' وہ خفگی سے بولیں۔

اپنے گھر کے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہوا۔ شاید روز ہی اتنی گھٹن رہتی ہو، مگر آج احساس زیادہ تھا۔ کیا کسی کا انتظار ہی زندگی کو دلچسپ بناتا ہے۔

''گھڑی دیکھو پانچ بج رہے ہیں۔''

''چوبیس گھنٹے میں گھڑی کی سوئی دو بار پانچ بجاتی ہے اور تم کہہ رہی ہو تو ضرور اس وقت پانچ بج رہے ہوں گے۔'' روی نے ہمیشہ کی طرح لاپرواہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہاسٹل جانا ہے دیر ہو جائے گی۔''

''سچ مچ ناراض ہو۔'' اس نے مسخرے پن سے کہا۔

''چلو کافی پینے چلتے ہیں۔''

''بی بی جی چائے۔'' ماسی نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی میں کھڑکی میں آ گئی۔ بچے نہیں تھے، شاید وہ لوگ آئس کریم کھانے جا چکے تھے۔ میں نے فریج کھولا۔ فریزر میں آئس کریم کا پورا برک رکھا ہوا تھا۔ میں شاید کل لائی تھی یا پرسوں۔ مجھے یاد نہیں آیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے ٹی وی کھولا۔ وہی گھسی پٹی کہانی کو دہراتا سیریل...... رونا دھونا اور ہنسی...... ایک کے بعد ایک چینل بدلتی رہی۔ کھانا کھا کر اٹھی تو گپتا جی کے گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے کمرے کی لائٹ بجھائی اور کھڑکی پر آ گئی۔ نیلے کھلے آسمان پر چاند تاروں کے بیچ جگمگا رہا تھا اور چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چاند بھی تو بالکل تنہا ہے شاید میری ہی طرح۔ جبھی تو مجھے اس سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔

میں گھنٹوں اس کھڑکی پر کھڑی رہتی ہوں...... مگر حیرت ہے مجھے کبھی اکتاہٹ کا شائبہ بھی نہیں ہوتا...... ڈھیروں باتیں اس سے کرتی ہوں...... صبح سویرے سے شام تک کی میری روداد وہ چپ چاپ سنتا رہتا ہے کبھی کبھی وہ بادلوں میں گم ہو جاتا ہے شاید میری بے تکی باتوں سے گھبرا کر...... مگر میں پھر اسے منا لیتی ہوں...... اور وہ واپس آ جاتا ہے اسی طرح...... یکا و تنہا بالکل میری طرح...... میری باتیں سننے کے لیے میری تنہائی کو بانٹنے کے لیے...... میرے کتنے ہی راز اس کے سینے میں دفن ہیں وہ تمام باتیں جو میں روی سے کرنا چاہتی تھی...... مگر وقت نہیں ملا۔

''سنو کل میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔''

''...... مگر کیوں......؟''

''کوئی یاد آ رہا تھا۔''

''پھر...... پھر کیا کیا؟''

''تمہاری طرح چاند سے ڈھیروں باتیں کرتا رہا مگر وہ اچانک بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا...... پتا نہیں کیوں......؟''

''ہو سکتا ہے تمہاری باتیں اس کو اچھی نہ لگی ہوں۔''

''تو کیا تمہیں میری باتیں اچھی نہ لگیں تو تم چلی جاؤ گی۔''

خاموشی...... ایک لمبی خاموشی...... مگر خاموشی کی بھی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ روی چونکا تھا اور نرملا بھی۔

''مگر ہمیں تو محبت ہے۔''

اقرار کے باوجود لہجوں میں ہچکچاہٹ تھی...... کیوں......؟

''چلو ہم شادی کر لیتے ہیں۔'' روی نے نرملا کا ہاتھ پکڑا۔

''پاگل ہو گئے ہو، اس طرح۔''

''پاگل ہی تو ہیں جبھی۔'' روی کی گرفت اور سخت ہو گئی۔

''میں پاگل نہیں ہوں اور پھر ابھی مجھے پڑھنا ہے اور......''

''چھوڑ دو یہ سب...... میرا بزنس ہے کیا ضرورت ہے پڑھنے کی۔''

''روی مجھے وقت چاہئے سوچنے کے لیے۔''

''سوچنے کے لیے وقت چاہئے...... چار سال سے ہم ساتھ ہیں اور پھر کیا یہ بات تمہارے لیے اہم نہیں ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔''

''میں......؟ یا ہم؟''

روی کی گرفت ہلکی پڑ گئی۔ اسے سوال کے بدلے سوال کی توقع نہیں تھی شاید...... اور اس دن سے چاند میرا ہو گیا تھا...... میری تنہائیوں کا اکلوتا ساتھی...... مگر آج پتا نہیں کیوں اپنی ویرانیوں کو بانٹنے کے لیے چاند کی یہ دوری مجھے بہت کھل رہی تھی...... میں مڑی، یکایک چاروں طرف کے منظر دھندلا گئے چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ میں سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی...... ٹکرائی، شاید کتابوں کی الماری سے...... سنبھلی اور ٹٹولتے ہوئے بجلی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ لمحوں میں کمرہ روشنی میں نہا گیا، میں واقعی الماری سے لڑی تھی...... کتابیں...... پوری الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی...... میں نے اس پر ہاتھ پھیرا...... بے جان...... بے حس کتابیں...... بھلا یہ میری تنہائی کو کیا دور کریں گی۔ یہ تو میرے لیے محض ایک ڈھال کی طرح ہیں...... تعلیم کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں، کہیں یہ ضرورت ہوتی ہے...... تو کہیں شوق...... تو کہیں مجبوری، کہیں زندگی گزارنے کا ذریعہ تو کہیں دل بہلانے کی وجہ...... میرے لیے پہلے یہ شوق بنی پھر ایک ڈھال بنی اور اب ضرورت...... تعلیم کے بھروسے ہی مجھے ایک اچھی نوکری ملی اور ایک بڑی تنخواہ...... جس کا زیادہ تر حصہ میرے گھر والے بڑے دعوے کے ساتھ استعمال کرتے...... ''ہماری بڑی بیٹی

دہلی کی ایک مشہور کمپنی میں بہت بڑے عہدے پر ہے۔'' ہر آنے جانے والے کو یہ جملہ سنایا جاتا...... اور وہ مرعوب ہو جاتے...... میری ضرورت بھی یہیں ختم ہو جاتی اور جب مجھے اپنی ضرورتوں کا خیال آیا تو وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ میری لیاقت اور قابلیت کا دبدبہ اور موٹے فریم کے چشمے سے جھانکتی ذہین آنکھوں کی ضرورت لوگوں کو صرف پروفیشنل پرابلمز کی گتھیاں سلجھانے کے لیے پڑتی ہیں۔ آج بھی مردوں کو عورتوں کا وہی روپ بھاتا ہے جو برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ عورت جسے گھور کر دیکھو تو پرے ہو جائے، پیار سے نظر ڈالو تو نہال ہو جائے، کبھی سر پر بٹھائی جائے تو کبھی قدموں تلے روند ڈالی جائے۔ مگر تعجب ہے اس عورت پر جس کو یہ احساس ہی نہیں کہ وہ کب پیروں تلے کچلی جا رہی ہے اور کب سر پر بٹھائی جا رہی ہے...... وہ تو ہر حال میں راضی ہے...... مگن ہے...... مست ہے؟ کون ہے یہ...... وہی عورت نا جس کی تمنا ہر مرد کرتا ہے۔ شاید روی کی تلاش بھی ایسی ہی عورت کی تھی...... روی...... میں ٹیرس پر آئی...... گپتا جی کے گھر کی بتیاں اب بجھی تھیں۔

مارننگ واک سے لوٹی تو اسمارٹ اور ہینڈسم سے مسٹر گپتا سلیپنگ سوٹ میں گیٹ پر کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے ٹنکو اور گڑیا اسکول یونیفارم میں بھاری بھاری بیگ کندھوں پر لٹکائے کھڑے تھے۔ بچوں نے مجھے وش کیا تو میں رک گئی۔ مسز گپتا پانی کی بوتل لیے اندر سے آتی نظر آئیں۔

''صبح صبح اتنا کام ہوتا ہے...... اور ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ بچوں کی بوتل ہی بھر دیں۔ بہت احسان کیا مجھ پر جو باہر آ گئے...... مگر یہ اخبار...... بچوں کے بجائے اخبار لے کر کھڑے ہو گئے۔'' مسٹر گپتا مڑے...... مسز گپتا کی نظر مجھ پر پڑی۔

''میرے شوہر''

''ہیلو''

''مس پانڈے میں نے بتایا تو تھا، بھول گئے۔'' مسز گپتا نے انہیں گھورا۔

''ہاں ہاں...... ہماری کمپنی کے فائنانس آپ لوگ ہی دیکھتے ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہ رہا تھا، وہ ورما کے ٹنڈر کے سلسلے میں۔''

"ہاں ہاں...... آپ کل آجائیے۔"

مسٹر گپتا نے گیارہ بجے آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے پنک ساڑی پر بڑی سی بندی لگائی۔ بھاری بھرکم جوڑے کی جگہ بالوں کو بینڈ میں پھنسا کر کھلا چھوڑ دیا تھا اور سچے موتیوں کی سفید مالا جو بہت تلاش کے بعد مجھے ملی، گلے میں ڈالی۔ مسز گپتا کو اکثر میں نے ایسے ہی تیار ہوتے دیکھا تھا، میں اس کے نقش قدم پر چل رہی ہوں...... کیوں؟

آفس میں شاید میری اس تبدیلی کو سبھی نے محسوس کیا تھا۔ خاص کر ٹینا نے...... مگر میں اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر آگئی۔ کمرے کی سٹنگ بدلی اور مسٹر گپتا کے آنے پر ان کی پسند کی بلیک کافی سروکی۔ ان کو تعجب بھی ہوا...... میری طرف ایک آدھ بار انہوں نے نظریں بھی اٹھائیں...... میں منتظر رہی...... مگر انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا اور خاص نوٹس لے کر جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ میرا بے حد اچھا موڈ خراب ہوگیا۔ میں نے بیگ سے آئینہ نکالا۔ پتا نہیں میں کیسی لگ رہی تھی...... میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ فائلوں کا پلندہ لیے ٹینا اچانک اندر آگئی۔ میری ہی ہم عمر تھی وہ...... میں جب بھی کمرے سے باہر نکلتی اس کو آئینہ لیے کبھی بال ٹھیک کرتے دیکھتی تو کبھی لپ اسٹک یا بندی...... کئی بار اس کی اس حرکت پر میں اسے ڈانٹ بھی چکی تھی...... اور آج...... میں نے چشمہ درست کرتے ہوئے فائل پر سائن کرتے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھا۔ نیل پالش لگانا تو میں بھول ہی گئی تھی۔ ٹینا کے لمبے لمبے ناخنوں پر براؤن پالش بہت اچھی لگ رہی تھی اور جدید ڈیزائن کا بریسلٹ بھی اپنی طرف متوجہ کررہا تھا۔ میری تیاری ادھوری تھی جبھی تو مسٹر گپتا...... مسز گپتا کے ہاتھ مجھے یاد آئے...... ترشے ہوئے ناخن پر ڈارک نیل پالش اور طرح طرح کے بریسلٹ اور چوڑیاں...... پتا نہیں کہاں سے خریدتی ہیں یہ سب...... عرصہ ہوا میک اپ اور سجاوٹی سامان خریدنا میں نے ترک کردیا تھا۔ ٹینا سے ہی پوچھنا چاہیے۔ یہ میری مدد کرسکتی ہے مگر۔

"میڈم آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" اس کی آواز آئی میں خوش ہوگئی۔

مسٹر گپتا سے اکثر ملاقات ہوجاتی...... کبھی آفس کے لیے نکلتے وقت تو کبھی واپس ہوتے ہوئے...... میری گاڑی کئی دن گیراج میں رہ گئی تو میری نا، نا کے باوجود مسٹر

گپتا مجھے آفس چھوڑنے لگے۔ میں سریتا یعنی مسز گپتا کے رنگ، اسٹائل اور بناؤ سنگھار کے روپ میں ڈھلتی جارہی تھی۔ میں اور سریتا...... سریتا اور میں...... شاید سریتا نے بھی یہ محسوس کیا تھا...... جبھی اس نے کہا تھا۔

''آپ کی گاڑی کو گیراج میں گئے سات دن ہوگئے۔ اب تک تو ٹھیک ہوجانی چاہیے۔''

''سات دن۔'' میں تو بھول ہی گئی تھی سریتا کا حساب درست تھا میں نے گیراج فون کیا اور گاڑی آگئی۔

آج پھر کمرے میں گھٹن زیادہ تھی، میں گیٹ کے باہر آگئی۔ مسٹر گپتا فیملی کے ساتھ شاید کہیں جارہے تھے۔

''آیئے نرملا جی ہم بچوں کو آئس کریم کھلانے جارہے ہیں آپ بھی آیئے۔'' مسٹر گپتا نے گاڑی روکی، سریتا نے بھی مسٹر گپتا کی ہاں میں ہاں ملائی اور میں ہچکچاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آفس جاتے ہوئے مسٹر گپتا کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے پہلے بیک سیٹ پر کب بیٹھی تھی...... اسکول سے لے کر آج تک مجھے ہمیشہ فرنٹ سیٹ ملتی رہی ہے...... مگر آج...... سریتا کی موجودگی نے مجھے پیچھے بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا...... واپس اترتے ہوئے میں نے مسٹر گپتا کا شکریہ ادا کیا اور اندر آگئی۔

سریتا...... سریتا...... جتنی بار یہ نام میری زبان پر آرہا تھا، میرے منہ کا مزہ کڑوا ہوتا جارہا تھا۔ آفس کے کام سے میں دو تین روز کے لیے شہر سے باہر گئی تو ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔

''کل ٹنکو کی برتھ ڈے ہے آپ ضرور آیئے گا۔ آپ کے جانے کے بعد ہم نے آپ کو بہت مس کیا۔''

''ضرور...... آپ لوگوں کی کمپنی مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے۔'' میں خوش دلی سے بولی۔

''ہم لوگ اکثر گھومنے جاتے رہتے ہیں۔ اس دن مسٹر گپتا نے کہا، بے چاری اکیلی رہتی ہیں، بور ہورہی ہوں گی، انہیں بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔''

''بے چاری'' وہ واپس جانے کے لیے مڑی، جی چاہا سامنے رکھا گملا اس کے سر پر دے ماروں۔ کیا حیثیت ہے اس کی میرے سامنے...... مسٹر گپتا کے ساتھ دس منٹ کی میٹنگ میں ان کو اتنی اچھی ڈیل مل گئی...... آگے بھی میں ان کی مدد کر سکتی ہوں...... اور سریتا ایک عام سی گھریلو عورت، آلو اور مٹر کا حساب کرنے والی...... نان سنس...... میرے لمبے چوڑے بینک بیلنس اور مہینہ کی تنخواہ کا مقابلہ کر سکتی ہے وہ...... ہے کوئی حیثیت اس کی مسٹر گپتا کے بغیر۔

پارٹی میں میرے اسٹائلش ڈریس اور میچنگ کو سب نے سراہا، ٹنکو کو میرا تحفہ بے حد پسند آیا اور ہارمونیم کی دھن پر میرا گایا گانا سب نے خوب خوب سراہا۔ مسٹر گپتا کو یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ میں پیانو بھی بہت اچھا بجا لیتی ہوں۔

''پیانو سیکھنا میرا بہت پرانا خواب ہے ہو سکتا ہے آپ کی بدولت یہ خواب حقیقت میں بدل جائے۔'' سی آف کرتے ہوئے مسٹر گپتا نے بے حد عاجزی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میں بہت اچھی ٹیچر ثابت ہوں گی، بشرطیکہ شاگرد بھی sincere ہو۔''

پیانو سیکھنا مسٹر گپتا کا خواب ہے...... اور یہ خواب اب میں حقیقت میں بدلوں گی...... میری آنکھوں میں بہت سے سوئے ہوئے سپنے جاگے۔ میں کھڑکی پر آئی...... مجھے لگا چاند مجھے حسرت بھری نگاہوں سے تاک رہا ہے...... بچھڑ جانے کے خوف سے...... اچھے ساتھی سے بچھڑنا واقعی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے...... اس وقت میں مسٹر گپتا کو پیانو بجانا سکھاؤں گی...... میں نے چاند سے کہا...... مگر تم تو عادی ہو اس تنہائی کے...... اور میں نے کھڑکی بند کر دی۔

سفید کرتا پائجامہ پہنے مسٹر گپتا کمرے میں داخل ہوئے اور بے ترتیبی سے اپنی انگلیاں پیانو پر چلائیں۔

''شاگرد کو پہلے سبق کا انتظار کرنا چاہئے۔'' میں ہنسی۔

''اوہ ساری...... کیا ہے پہلا سبق۔'' مسٹر گپتا سر جھکاتے ہوئے میرے برابر

میں بیٹھتے ہوئے بولے۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی...... مسز گپتا اندر آئیں۔ میں کھڑی ہو گئی۔
''موسیقی کا پہلا سبق ہم دونوں ساتھ ساتھ سیکھیں گے۔'' اپنا حساب کتاب ہمیشہ درست رکھنے والی سریتا ہم دونوں کے بیچ بیٹھتے ہوئے بولی۔ مسٹر گپتا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ یکا یک کمرے میں گھٹن بڑھ گئی میں نے کھڑکی کھولی چاند میرے بالکل سامنے تھا۔

یکا تنہا

مجھے بڑبڑاتے ہوئے دیکھ کر جاوید نے تردد سے مجھے مخاطب کیا۔ ''عبدل چاچا۔'' مگر مجھے ایسا لگا جسے کسی نے سنہرے خوابوں کی دنیا سے جگا دیا ہو۔ نہیں خواب نہیں میرے لئے تو یہ ایک حقیقت ہے۔ جس کا میں پہلے کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

جاوید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہلایا تو میری آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوں اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے شاید اسے اندیشہ ہوا کہ میں پاگل تو نہیں ہو گیا ہوں خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری موت حقیقت میں میرے گھر والوں کے لئے اتنی منافع بخش ثابت ہوگی۔ خوشی اور غم کے اس امتزاج کو میں دنیا کے سامنے کس طرح لاؤں؟ زندگی نے اب تک مجھے غم، کڑواہٹ اور تکلیف کے سوا کوئی اور مزہ دیا ہی نہیں تھا، کاش میں شاعر ہوتا تو غزلوں اور نظموں کی شکل میں اپنی اس خوشی کو بیان کرتا ادیب ہوتا تو الفاظ کے خوبصورت تانے بانے سے دنیا کے سامنے یہ حقیقت لاتا یا فوٹو گرافر ہوتا تو رنگین تصویروں کے ذریعہ اپنی کہانی ظاہر کرتا۔

مگر میرے پاس تو صرف یہ چند آنسو میرا کل اثاثہ ہیں۔ میں پاگل کیوں نہیں ہوا یہی سوال میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

''چاچا کیا ہوا۔'' جاوید کے ساتھ اب دانش بھی میرے قریب آ گیا تھا۔

''ارے کچھ نہیں۔بس بارہ نمبر والے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے میرا اپنا بیٹا میرے سامنے ہو۔'' ایک ایک لفظ چباتے ہوئے میں نے کہا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو پراسرار نظروں سے دیکھا اور سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہے ہوں ''سٹھیا گیا ہے بڈھا۔'' جاوید فرائی پین اٹھا کر کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دانش بھی اٹھ گیا اور میں بے چارگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔

تیس سال پہلے کے اس واقعہ کو جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا تھا میں نے اپنی زندگی سے نکال پھیکا تھا۔ مگر آج میرے سامنے ورق ورق پلٹ رہا ہے میں چاہتے ہوئے بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا کیسے ہو گیا تھا وہ سب اپنے گھر کا وہ منظر مجھے پوری طرح یاد ہے۔

اماں، زینب، میں اور میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے، مجھے اپنے گھر سے پیار تھا، اماں سے محبت تھی زینب اور تینوں بچوں سے لگاؤ تھا۔ مگر پیسوں کے بغیر کیا کوئی رشتہ معتبر ہو سکتا ہے۔ محبت اظہار چاہتی ہے اور جزبات کا اظہار تو پیسے سے ہی ہوتا ہے۔ روز محنت مزدوری یا چھوٹی موٹی نوکری کرنے والا بھلا ماں، بیوی اور بچوں کو معمولی سی آمدنی میں کس طرح خوش رکھ سکتا ہے؟ روز صبح کالی چائے اور رات کو سوکھی روٹی جب اماں میرے سامنے سرکاتیں تو میں چور سا بن جاتا۔ آدھی آدھی روٹی بچوں میں بانٹ کر جب زینب ان کو گلی میں کھیلنے کے لئے بھیجتی تو میں اسے ان کی بدنصیبی نہیں بلکہ اپنی نا اہلی سمجھتا۔ اسکول جانے کی عمر میں وہ محلے والوں کی جھڑکیاں سنتے اور میں اپنے آپ کو قصوروار مانتا۔ رات کی ملگجی روشنی میں زینب کے مشین پر چلتے ہوئے ہاتھ مجھے اپنی گردن پر محسوس ہوتے اور میں گھبرا کر اٹھ جاتا۔ ''کل کہیں اچھا کام دیکھوں گا۔'' میں اپنے آپ سے کہتا۔ مگر دوسرا دن بھی پہلے دن کی طرح یوں ہی گزر جاتا۔ شام کو مجھے خالی ہاتھ آتے دیکھ کر زینب کی سلوٹیں اور گہری ہو جاتیں۔ اماں ایک ٹھنڈی سانس لے کر چھوڑتیں اور دوپٹے کے کونے سے مڑا تڑا نوٹ میری طرف

بڑھا کر کہتیں: ''سودا لے آؤ تو چولہا جلے۔'' مگر آگ تو میرے سینے میں سلگ جاتی۔ کاش میں دوسرے بہت سے مردوں کی طرح ان پیسوں کی دارو پی کر ہر غم سے آزاد ہو سکتا۔ ہذیان بکتے بکتے شاید میرے سینے میں لگی آگ کچھ ٹھنڈی ہو جاتی۔

زینب تو شروع سے ہی مجھے نکما سمجھتی تھی۔ مگر اب شاید اس نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ نہ چلاتی تھی، نہ بڑبڑاتی تھی، بس ایک نظر مجھ پر ڈالتی اور کام میں لگ جاتی۔ غریب گھر کی بیٹی تھی۔ شادی سے پہلے بہتر زندگی کے سپنے دیکھتی رہی ہوگی۔ پیٹ بھر روٹی، ایک اچھی چھت، گلیوں میں ناک بہاتے گھومتے بچوں کے بجائے صاف ستھرے کپڑے پہنے اسکول جاتے بچوں کے سپنے۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی: ''ہم بچوں کو خوب پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائیں گے، تاکہ بڑھاپے میں آرام کی زندگی گزرے۔'' مگر چھ سال کا جیدی جب سارا دن گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتا پھرا تو اس نے سب کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ شاید جوانی کے بعد اب اچھے بڑھاپے کا اس کا خواب ٹوٹ چکا تھا۔

یکا یک تقدیر نے ایک ایسا پتہ پھینکا جس نے ہماری زندگی کا رخ ہی پلٹ دیا۔ ان دنوں شہر کی حالت خراب سے خراب ہو رہی تھی۔ فرقہ وارانہ فساد نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کسی بھی وقت فساد ہو جانے کا خطرہ ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ گھر میں پیسہ تھا، نہ غلہ۔ اماں نے مجھے گاؤں رحیم کاکا سے کچھ پیسے لینے کے لئے بھیجا۔ پیسہ لے کر میں لوٹ رہا تھا کہ فساد پھوٹ پڑا اور کرفیو کا اعلان ہو گیا۔ میں نہ تو گاؤں لوٹ سکتا تھا اور نہ گھر پہنچ سکتا تھا۔ پولیس والے بار بار اعلان کر رہے تھے کہ دس منٹ کے بعد اگر کوئی اپنے گھر سے باہر نظر آیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ موت میرے سامنے تھی۔ بے سوچے سمجھے میں ایک گھر میں گھس گیا۔ میری مجبوری جان کر ان لوگوں نے مجھے پناہ دی۔ مگر میرا دل ہر وقت گھر کی طرف لگا رہتا۔ پتہ نہیں سب کیسے ہیں؟ کھانے کے لئے کچھ ہے بھی یا نہیں؟ بیسیوں سوال میرے ذہن میں آتے۔

خدا خدا کر کے کرفیو کچھ وقت کے لئے کھلا، مگر الگ الگ علاقوں میں، قسطوں میں۔ اس لئے میں چاہتے ہوئے بھی گھر نہیں جا سکا۔ آٹھ دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک

رات گھبرا کر میں چپ چاپ اپنی پناہ گاہ سے نکل گیا اور بچتے بچاتے کسی طرح اپنے محلے میں پہنچ گیا۔ کئی بار تو ایسا لگا کہ پولیس والے پکڑ ہی لیں گے مگر صحیح سلامت گھر تک آ گیا۔ مگر سامنے کا منظر دیکھ کر میرا دل دھڑ کا۔ پولیس والے میرے گھر کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ کچھ لوگ گھر کے اندر آ جا بھی رہے تھے۔ ایسی صورت میں سامنے سے گھر میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لئے اپنے دھڑ دھڑاتے دل کو قابو کرتے ہوئے میں گھر کے پیچھے کی طرف آیا اور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے حالات کا اندازہ کیا۔

تینوں بچے سو رہے تھے۔ اماں اور زینب زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے سکون سا ہوا۔ مگر باہر پولیس کیوں تھی؟ میں کان لگا کر اپنے گھر کے اندر کی باتیں سننے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے معاملے کا اندازہ ہو گیا تو میری ہنسی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ فساد میں مرنے والوں میں پتہ نہیں کیسے میری شناخت ہو گئی تھی اور اب وہ مجھے مرا ہوا سمجھ رہے تھے۔ زینب کا سوگوار چہرہ اماں کی سوجی آنکھیں دیکھ کر مجھے اندر ہی اندر بہت ہنسی آئی۔ دل میں آیا کہ وہیں سے پکاروں۔ مگر پتہ نہیں کیوں یہ تماشا مجھے اچھا لگ رہا تھا اور میں ویسے ہی کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب کا بھائی اور میرے ماموں آئے۔

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا زینب باجی، اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ سرکار نے ایک لاکھ روپیہ دیا ہے۔''

''اور کیا! پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔ کچھ زور لگایا جائے تو باہر سے بھی کچھ مدد آ سکتی ہے۔'' میرے ماموں نے اپنی دانست بڑی عقل کی بات کی۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ ایک لاکھ! اتنا روپیہ تو میں اپنی زندگی میں حاصل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

زینب کا بھائی اور میرے ماموں دونوں بیٹھ کر اماں اور زینب کو ان پیسوں کا جائز اور منافع بخش استعمال بتا رہے تھے۔

''ایک دو کمرے بنوا کر کرائے پر اٹھا دو۔'' زینب کے بھائی کا خیال تھا جو مجھے بھی اچھا لگا۔ کتنی تمنا تھی اچھے گھر کی۔ میں جو زندہ رہ کر نہ کر سکا، میری موت نے وہ کر دکھایا۔ اور

میں نے اسی وقت طے کرلیا کہ میں ان لوگوں کے سامنے نہیں آؤں گا۔ کسی اندھیرے میں گم ہو جاؤں گا مگران کی زندگی میں آنے والے ہلکے سے اجالے کو ختم نہیں ہونے دوں گا۔ میرا کیا ہے؟ کچھ دن وہ لوگ روئیں گے، تڑپیں گے، پھر بہتر زندگی کو محسوس کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ اور پھر میں خیر سے زندہ ہوں۔ کبھی میری ضرورت پڑی تو ان کے سامنے آ بھی سکتا ہوں۔ حسرت بھری ایک نگاہ میں نے سب پر ڈالی اور رات کے اندھیرے میں اپنے ہی شہر کی انجانی راہوں پر چل پڑا۔ بے دھیانی میں سامنے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار کے سامنے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر گیا۔ وہ بھلے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور پھر میرے کہنے پر اپنے گھر میں ہی نوکری دے دی۔ چند دنوں میں ہی میں نے برسوں کی مسافت طے کرلی۔ حلیہ ایسا بدلا کہ ہمارے محلے میں رہنے والا دھوبی مجھے سامنے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکا اور میرے بارے میں مالکن سے بات کرنے لگا۔ پہلے اس نے میری تعریف کی، پھر میری غریبی کا ذکر کیا، میری اماں اور بیوی بچوں سے ہمدردی جتائی اور اس کے بعد رازداری سے بولا: ''لاکھ روپیہ دیا ہے مالکن سرکار نے۔ اور بھی ملنے کی امید ہے۔ سمجھ لو گھر کی حالت سدھر جائے گی۔ اس کی عورت کو سنا ہے نوکری بھی ملنے والی ہے۔''

میم صاحب غور سے سنتی رہیں اور وہ ان کی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ میں بھی خوش تھا کہ چلو اچھا ہے، زینب کو نوکری مل جائے گی، پھر بچے اسکول جانے لگیں گے۔

اس دن کے بعد میں اکثر چھپتے چھپاتے زینب اور بچوں کو دیکھ آتا۔ میرے مرنے کا غم دھیرے دھیرے ڈھل گیا تھا۔ گھر کی حالت بھی سدھر گئی۔ کچی دیوار کی جگہ پکی دیواروں نے لے لی۔ ٹین کی چھت والے دالان کی جگہ شاید باورچی خانہ بن گیا اور بھی کئی تبدیلیاں ہوئیں جن کو میں باہر سے دیکھ نہیں سکا۔ بچے اسکول جانے لگے۔ مشین کی سلائی شاید بند ہو گئی تھی، کیونکہ زینب کو نوکری مل گئی تھی۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مگر میری زندگی عذاب بن گئی۔ سب کے اتنے قریب رہ کر اتنا دور رہنا میرے برداشت کے باہر ہو جاتا تھا۔ قدرت کو شاید مجھ پر بھی رحم آ گیا۔ میری محنت اور ایمان داری دیکھ کر میرے مالک نے

مجھے باہر کام کے لئے بھیجنا چاہا تو میں فوراً تیار ہو گیا۔ ٹکٹ اور ویزا کا انتظام صاحب نے ہی کیا اور میں سمندر پار ان کے اسٹور کے کام کو سمجھ کر ایر پورٹ آ گیا۔

اپنا ملک، شہر، محلہ، ماں، بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر میں عرب کی متبرک سرزمین پر پہنچ گیا۔ سارا دن میں محنت سے کام کرتا اور باقی وقت اللہ کی عبادت میں گزارتا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ جب بیٹھتا اور وہ اپنے وطن کی، اپنے پیاروں کی باتیں کرتے تو میں حسرت سے انہیں تکتا۔

''عبدل جب تمہارا ہندوستان میں کوئی نہیں ہے تو پھر یہاں کس کے لئے آئے ہو؟'' اپنا پیسہ لاپروائی سے خرچ کرتے دیکھ کر میرے دوست اکثر مجھ سے پوچھتے۔

''اپنی پہچان مٹانے کے لئے۔'' میں اطمینان سے کہتا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ عجیب انداز سے مجھے دیکھتے۔ اس گھن چکر میں وقت گزرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد میں نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے لیا۔ دانش اور جاوید کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میرے مالک میرے کام سے مطمئن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچیس سال کا لمبا عرصہ گزر گیا لوگ آتے، چار پانچ سال رہتے اور واپس وطن چلے جاتے، مگر میرا تو سب کچھ یہیں تھا۔

ایک دن میرے مالک کا فون آیا کہ ان کے بیٹے کا دوست ڈاکٹر کی حیثیت سے آنے والا ہے۔ صاحب نے مجھے ان لوگوں کی دیکھ بھال اور گھریلو معاملوں میں ان کی مدد کرنے کی ہدایت کی۔ ایر پورٹ پر جنید بابو کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے وطن کی یاد آ گئی۔ ان کے بیوی بچے ساتھ تھے۔ رات گئے جب میں اپنے گھر واپس جا رہا تھا تو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ ان کے دونوں بچے مجھے بابا، بابا کہتے نہیں تھک رہے تھے۔ سامان لانے اور سیٹ کرنے میں دو دن لگ گئے۔ اس کے بعد بھی میں روزانہ ان کی ضرورتوں کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے جاتا رہا۔ ان سب کے ساتھ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

ایک روز میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو دیوار پر لگی تصویر دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک گیا۔ یہ تصویر۔؟ یہ تو وہی تھی جو میری شادی کے موقع پر زینب کے بھائی نے کھینچی تھی۔ کسی فلم کی طرح بہت سے مناظر تیزی سے میری آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ یہ تصویر اگر

میری ہے تو یہاں، اس ڈرائنگ روم میں کیسے۔ اپنے پیروں پر قابو نہیں رہا تو میں وہیں بیٹھ گیا۔

''یہ...... یہ تصویر کس کی ہے؟'' بھو جی سے میں نے پوچھا۔

''یہ جنید کے والد ہیں۔ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''کیا!'' ایک چیخ جیسی آواز میرے منہ سے نکلی۔

''ہاں وہ گزر چکے ہیں۔ یہ تصویر ہمیشہ جنید اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔'' بھو جی نے کہا۔ شہناز کچھ اور بھی بتانا چاہ رہی تھی، مگر مجھے اپنے اوپر قابو ہی کب تھا۔ وہ مجھے آوازیں دیتی رہیں، لیکن میں رک نہیں سکا اور واپس آ گیا۔

تو یہ جیدی ہے۔ ڈاکٹر جنید! اتنا بڑا ڈاکٹر بن کر میرا بیٹا میرے سامنے ہے اور میں اسے پہچان ہی نہیں سکا۔ اور باقی سب پتہ نہیں کہاں ہیں...... زینب، ارجمند......

''چاچا! کھانا تیار ہے۔ آیئے۔'' دانش نے میری سوچ پر بریک لگا دیا اور میں بے دلی سے اٹھ گیا۔

اب میرا زیادہ تر وقت جنید کے گھر ہی گزرنے لگا۔ کتنی اپنائیت کا احساس ہوتا مجھے وہاں پہنچ کر، ارم اور فراز خاص طور سے مجھ سے لگے رہتے۔ میں گھنٹوں ان بچوں کو ٹہلاتا، نئی نئی جگہیں دکھاتا، ڈھیروں باتیں کرتا۔ انڈیا کی گھر کی پڑوسیوں کی اور سب سے بڑھ کر زینب کی۔

ایک دن تو فراز نے میری چوری بھی پکڑ لی۔ بہت شیطان ہے وہ بالکل جنید کی طرح۔ ہوا یہ کہ گھر کی باتیں کرتے کرتے میں روانی میں بول گیا: ''ارجمند کہاں ہے؟''

''ارے بابا! آپ کو پھوپھو کا نام کیسے معلوم ہو گیا؟''

میں ہڑبڑایا۔ ''وہ دراصل...... کل آپ کی ممی کہہ رہی تھیں تو میں نے سنا تھا۔''

''پھوپی تو میڈم ہیں وہ پڑھاتی ہیں۔''

''اور میرے لئے ٹافی بھی تو لاتی ہیں۔'' ارم نے بڑی بڑی آنکھیں نکالیں۔

پتہ نہیں ہر ایسی بات پر میری آنکھیں کیوں بھر آتی تھیں۔ یہ میری عمر کا تقاضا تھا یا میرا احساس محرومی۔ عمر کا یہ حصہ میں گھر میں اپنوں کے بیچ گزارنا چاہتا تھا۔ مگر سب سے

اتنے قریب رہ کر میں بیگانہ زندگی گزار رہا تھا۔ میں سب کے لئے مر چکا تھا، مگر پھر بھی زندہ تھا۔

اس دن گھر میں بچے اکیلے تھے۔ جنید شہناز کے ساتھ شاپنگ کرنے گئے تھے۔ میں بچوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رہا نہیں گیا، اس لئے پوچھ لیا: ''فراز تمہارے پاس گھر والوں کی تصویر تو ہوگی۔''

ارم دوڑ کر البم لے آئی اور میں غور سے ایک ایک فوٹو دیکھنے لگا۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ اپنا گھر تو بالکل بدل گیا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے کمرے کی جگہ پکے کمرے تھے۔ قیمتی پردوں سے آراستہ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ اور زینب...... میں تو اس کو پہچان ہی نہیں پایا۔ اس کی تعریف کے لئے کوئی جملہ سوچ ہی رہا تھا کہ ارم بولی: ''ہماری دادی بہت گریس فل ہیں۔ مجھ سے تو بہت پیار کرتی ہیں۔''

''اور مجھ سے بھی۔ ممی کہتی ہیں کہ دادی نے مجھے بگاڑ دیا۔ ہے۔'' فراز کہاں چپ رہنے والا تھا۔

''بابا، کیا میں بگڑا ہوا ہوں؟''

''نہیں بیٹا، تم تو بہت اچھے ہو۔''

زینب کی تصویر کو میں بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں وہ مجھے یاد بھی کرتی ہے یا نہیں۔ ساتھ گزارے ہوئے بہت سے لمحے میری نظروں کے سامنے آ گئے۔ زینب کا فوٹو میں نے چپکے سے نکال لیا۔ پتہ نہیں بعض حرکتوں پر ہمارا اختیار کیوں نہیں رہتا۔ اسی لمحے گھنٹی بجی۔ فراز نے دروازہ کھولا۔ مجھے یوں آرام سے بیٹھا دیکھ کر شہناز کو شاید اچھا نہیں لگا۔ اس نے دھیمے لہجے میں شوہر سے کہا ''فراز اور ارم ہر وقت بابا کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ آپ ان کو منع کیوں نہیں کرتے؟ کچھ مینرز نہیں سیکھ سکیں گے یہ دونوں۔'' پھر شاپنگ بیگ اٹھا کر وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

''بابا، کھانا کھا کر جائیں۔'' جنید نے نرمی سے کہا۔

''نہیں بیٹا، چلتا ہوں...... وہ...... فراز اور ارم اکیلے تھے، اس لئے......'' میں جملہ مکمل نہیں کر سکا اور باہر آ گیا۔

شہناز کی تیز نظریں میرے دل کے آر پار ہو گئی تھیں۔ مجھے جیدی کی پیدائش کا دن یاد آ گیا۔ ہماری شادی کے تین سال بعد بہت منتوں مرادوں کا بیٹا ہوا تھا۔ اماں نے پیروں فقیروں کی درگاہوں کے چکر لگائے تھے۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو پورے محلے میں لڈو بانٹے تھے۔ تھوڑا بڑا ہوا تو کندھے پر بٹھا کر میلے میں لے جاتا تھا۔ گھنٹوں چور سپاہی کا کھیل کھیلا کرتا تھا۔ ان لوگوں کے اچھے مستقبل کے لئے خود کو مرا ہوا ظاہر کیا۔ ان کی زندگی اور ان کی دنیا سے نکل گیا ہمیشہ کے لئے۔ اور آج...... شہناز کو میرا ساتھ اپنے بچوں کے لئے ناپسند تھا۔ مگر اس میں اس کی کیا غلطی ہے۔؟ اچھے مستقبل کے لئے بہت سے ماں باپ بچوں کو دادا دادی سے الگ رکھتے ہیں۔ پھر میں تو ان کی نظر میں صرف ایک نوکر ہوں۔ ٹھیک ہے، اب میں کم سے کم ان کے ہاں جاؤں گا۔

دو دن تک میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا، مگر تیسرے دن میرے قدم خود بخود ادھر بڑھ گئے۔ ارم اور فراز مجھے دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور میرے نہ آنے کی پیار بھری شکایت کرتے ہے۔ شہناز بھی مسکرائی۔

''بابا، بچے آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔ یہاں یہ آپ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے وقت ضرور نکالا کریں۔''

''میرا بھی ان کے سوا اور کون ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ شہناز میرا مطلب نہیں سمجھی۔

بچوں کے بیچ میرا وقت بہت اچھا گزرنے لگا دونوں کی انگلی تھام کر جب میں باہر نکلتا تو فخر کی ایک لہر میرے سینے میں اٹھتی اور اپنے مکمل ہونے کا احساس مسرت بخش ہوتا۔

پھر ایک دن میں نے سنا کہ زینب آنے والی ہے۔ میرا دل عجیب سے انداز سے دھڑکا۔ میں فراز اور ارم سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ خیر وہ دن بھی آیا جب جنید ایرپورٹ زینب کو لینے گئے۔

میری نظریں گھڑی کی جانب لگی تھیں۔ ان سب سے زیادہ مجھے زینب کا انتظار تھا۔ شہناز کچن میں تھی اور میں باہر کا دروازہ کھولے زینب کا منتظر تھا۔

میں نے زینب کو کار سے اترتے دیکھا۔ وقت نے ہم دونوں کے بیچ تیس سال کی اتنی لمبی فصیل کھینچ دی تھی کہ اتنے قریب ہو کر بھی ہم ایک دوسرے کو نہیں پہچان سکے تھے۔ ایک لمحے کو زینب ٹھٹکی۔ میں بھی آگے بڑھا۔ مگر پھر حیرت سے منہ کھولے میں زینب کو دیکھتا رہا۔

''یہ بابا ہیں۔'' جنید نے ہم دونوں کا تعارف کروایا تو میں سلام کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ زینب دونوں بچوں کو گلے سے لگائے شہناز کی طرف بڑھ چکی تھی۔ میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔

ارم نے ٹھیک کہا تھا۔ زینب واقعی بہت گریس فل لگ رہی تھی۔ ایسی تو وہ جوانی میں بھی نہیں تھی۔ بالکل میم صاحب کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ سفید ساڑی، بالوں کا جوڑا، ہاتھوں میں پرس اور آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ۔ مجھے تعجب بھی ہوا۔ وقت کے ظالم تھپیڑوں نے مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ گزرے ہوئے برسوں نے اپنی لکیریں میرے اوپر کچھ زیادہ ہی گہری نقش کر دی تھیں۔ اور زینب کے لئے وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ ورنہ میرے ساتھ رہتے ہوئے شاید اس کے چہرے پر بھی بے شمار خراشیں پڑ جاتیں۔ غریبی کی، ہماری لاچاری اور بے بسی کی لکیریں جو ہوا اچھا ہی ہوا۔

کام کے بعد کا سارا وقت میں ڈاکٹر جنید کے یہاں ہی گزارتا تھا۔ زینب میرے لئے ''بیگم صاحبہ'' تھی جو مقام میں اسے جیتے جی دینا چاہتا تھا، وہ میری موت نے دے دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ بہت خلوص سے پیش آتی تھی۔ میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش مند بھی تھی مگر میں ایسے ہر موقع کو بہت خوبصورتی سے ٹال جاتا تھا۔ شہناز کو البتہ میرا ہر وقت کا آنا جانا ناگوار گزرتا تھا مگر میں اسے درگزر کر جاتا۔ وہ ویسے بھی کچھ تیز دماغ کی تھی۔ اکثر ساس بہو میں بھی کھٹ پٹ ہو جاتی تھی۔

ایک دن میں گیا تو زینب کمرے میں لیٹی تھی شہناز کچن میں تھی زینب کے لیٹنے کے انداز سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ دونوں میں کچھ تکرار ہوئی ہے۔ زینب اور اماں کے درمیان جب کہاسنی ہوتی تو زینب اسی طرح کمرے میں جا کر لیٹ جاتی تھی۔ عادت کہیں بدلتی ہے بھلا۔ بس حالات بدل جاتے ہیں۔ رتبہ بدل جاتا ہے۔ پہلے وہ بہو تھی اور اب ساس۔ پہلے میں زینب کو سمجھاتا تھا تو وہ الٹا مجھ پر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔ میں ہنستے ہنستے

اس کی بات سن لیا کرتا، پھر کہتا: ''ماں کچھ کہتی ہیں تو ہمارے بھلے کے لئے ہی نا۔ اپنے غصے کو قابو میں رکھا کر۔'' مگر اب وہ اکیلی تھی۔ اگر آج میں اس کے ساتھ ہوتا تو شاید پھر سمجھاتا اور وہ اپنا غصہ مجھ پر اتار لیتی۔ مگر اب وہ شاید چپکے چپکے رو رہی تھی۔ شاید اس کو بھی پچھلا وقت یاد آ رہا ہوگا۔ دروازے پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا۔

''کون ہے؟'' کچھ آہٹ پا کر زینب بولی۔

''بیگم صاحبہ، میں ہوں کچھ کام تو نہیں ہے؟''

''نہیں'' مختصر سا جواب دے کر وہ بدستور لیٹی رہی۔ میں تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر باہر آ گیا۔ زینب کو شروع سے ہی چمک دمک متاثر کرتی تھی۔ اسی چکر میں وہ شہناز کو بہو بنا کر لائی ہوگی، ورنہ......

کئی دن تک میں ادھر نہیں گیا، مگر میرا دل زینب کی طرف ہی لگا رہا۔ پھر ایک دن ڈاکٹر جنید میری خیریت پوچھنے آئے۔ ان کے ساتھ فراز بھی تھا۔

''بابا، ہم سب آپ کو یاد کر رہے تھے۔ دادی بھی پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے ہی تو ہمیں یہاں بھیجا ہے۔'' فراز نے معصومیت سے کہا اور مجھے ایسا لگا جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی ہو۔

اس دن میں گیا تو بلڈنگ کی کئی عورتیں زینب کو گھیرے بیٹھی ہوئی تھیں اور بہت غور سے زینب کی باتیں سن رہی تھیں۔ میں نے بھی سنا۔ وہ میری ہی بات کر رہی تھی۔ تیس سال پہلے کی بات...... اس فساد کی بات جس نے مجھے گھر سے ہی نہیں بلکہ زندگی میں ہونے والے ہر غم اور خوشی سے دور کر دیا تھا۔ وہ سارے واقعات بیان کر رہی تھی اور سب لوگ آنسو بھری آنکھوں سے اس کی دکھ بھری داستان سن رہے تھے۔ میرے بعد اس نے کس طرح حالات کا مقابلہ کیا، کس طرح سب کو پڑھایا لکھایا۔ اور پھر روتے ہوئے وہ بولی۔ ''کاش وہ گاؤں نہ گئے ہوتے یا فساد ایک دن بعد ہوئے ہوتے تو مجھے بیوگی کی چادر نہ اوڑھنی پڑتی۔''

زینب رو رہی تھی، اپنی کہانی سنا رہی تھی اور میں پتھر بنا سوچ رہا تھا کہ زینب یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اگر وہ فساد نہ ہوتا تو کیا آج اس زندگی کا تصور ہم کر سکتے تھے مت رو زینب مت رو

میں اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ ہم ایک ساتھ رہتے تو کیا دے سکتے تھے ایک دوسرے کو۔ ہماری جدائی نے کم از کم ان کے مستقبل تو سنوار دیئے ہم تو ماں باپ ہیں...... ہمیں تو ہر حال میں ان کی خوشی عزیز ہونی چاہئے۔ پتہ نہیں کیوں یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

کاش مجھے موت آجائے۔ میں تھک گیا ہوں اپنی اس زندگی سے لڑتے ہوئے۔ کم از کم مجھے اپنے بیٹے کا کاندھا تو نصیب آجائے گا۔ اے خدا مجھے موت دے دے!

آخری تلاش

یوں تو اس بستی میں صبح سورج کی کرنوں کے پھیلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی تھی اور لوگ ملگجے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ضروریات سے فارغ ہو لیا کرتے تھے مگر آج ہر طرف خاموشی تھی۔ تیز جاڑوں کی شدت تھی۔ کہرے کی دبیز چادر نے ساری کائنات کو ہی اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔ آتے جاتے گہرے بادلوں کے بیچ سورج کی آنکھ مچولی جاری تھی کبھی بادل گہرے ہو جاتے تو کبھی ہلکی سی دھوپ بکھر جاتی......اس لیے منیا صبح کی ضرورت پوری کر کے واپس کھولی میں آ گئی تھی۔ جبکہ اس کا ڈیڑھ دو برس کا لڑکا باہر نکلنے کے لئے بے تاب تھا۔ اور وہ اسے تھپک رہی تھی۔

''اری اٹھتی کیوں نا۔'' فقیرا کی آواز آئی جو اپنی ہتھوڑی لوہے کے ٹکڑے پر بلاوجہ مار رہا تھا۔

''کاہے کو...... باہر پالا پڑت ہے، دیکھت ناہی۔''

''سُسری پڑی پڑی بھنا رہی ہے۔'' وہ غصے سے ہتھوڑی اور زور زور سے مارنے لگا۔

''مائی کچھ دے۔'' اس کا بڑا لڑکا سامنے کھڑا تھا۔

''کلیجہ کھالے ہمار...... اور کیا ہے۔''

''سُسری سر پہ چڑھی آتی ہے۔اٹھتی ہے کہ لگاؤں ایک'' ہتھوڑی اپنے اوپر تانتے دیکھ وہ جھکی جھکی کھولی سے نکلی...... کھڑے ہونے کی گنجائش تھی ہی نہیں اور ویسے بھی اندر اور باہر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ پھوس، بانس اور پھٹی پرانی بوریوں سے اس کھولی کو محض سر پہ چھت ہونے کا احساس دلانے کے لئے بنایا گیا تھا...... ورنہ سردی گرمی اور برسات کسی بھی موسم سے نجات دلانے کے لئے یہ ناکافی تھی۔ دور دور تک پھیلا کھلا آسمان ان کے ارمان، توقعات اور خواہشات سے شاید زیادہ بڑا ہوتا ہے۔اس لئے یہ لوگ اسے چاروں طرف سے ڈھاک کر اپنے لئے خود محدود کر لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ Stone age سے نکل کر خود کو ترقی یافتہ یا پھر تہذیب یافتہ انسانوں کی فہرست میں لے آتے ہیں۔

بدری کی بیوی رات کے بچے بھات پوچھ پوچھ کر کھا رہی تھی۔اس کو آتے دیکھ وہ باقی بچے چاول جلدی سے اپنے منہ میں ٹھوس کر نکل گئی۔

''کچھو نا بچا کھانے واسطے۔سب نمٹ گیو۔''

''تم کا ہے بک رہی ہو۔کھائے تو لیا۔''

''تلے کا لگا جاتا ہے۔دیکھ تو رہی ہو۔'' کجری کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔مگر اس سے پہلے کہ منیا کچھ مانگتی ریل کی آتی چھک چھک نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ Industrial Area ہونے کی وجہ سے رفتار میں کچھ کمی آ گئی۔ یہ ایکسپریس گاڑی آٹھ نو بجے کے بیچ یہاں پہنچتی تھی۔زیادہ تر مسافر اس وقت ناشتہ میں مصروف رہتے، اور آس پاس کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن کے لوگ صبح کی ڈیوٹی پر اسی گاڑی سے آتے تھے اور روز باقاعدہ Chain Pulling کے ذریعہ گاڑی روک کر اس بستی سے کچھ دور اتر جاتے۔ادھ ننگے میلے کچیلے لوگ مسافروں پر جیسے جھپٹ پڑتے...... غلاظت میں اٹے چھوٹے چھوٹے بچے کھانے کی چیزوں کو حسرت سے دیکھتے یا پھر صاف ستھرے مسافروں کے کپڑے کھینچتے یا ہاتھ لگاتے تو ان سے بچنے کے لئے جلدی سے کچھ پیسہ یا پھر بچا ہوا ناشتہ انہیں تھما دیتے تو ان سب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا۔آج بھی ایسا ہی ہوا کجری، منیا اور دوسرے بہت سے لوگ گاڑی کی

آواز سن کر پہلے سے ہی ادھر بھاگنے لگے۔ مگر آج گاڑی رکی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے سب تھک گئے اور گاڑی ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''کرفیو کی وجہ سے نا رکی'' نتھو لمبی سانس چھوڑتا ہوا بولا۔

''پھیکٹری تو بند ہے تو کاہے کو کوئی آتا'' سب نے خود ہی اپنے کو تسلی دی۔

''کرفیو کب کھلے گا'' دینو کی بیوی نے اپنے بھاگتے ہوئے لڑکے کو چانٹا مارتے ہوئے پوچھا۔

''کیا پتہ'' منیا بولی۔

''مائی کرفیو کاہے لاگا'' اس کے لڑکے نے پوچھا۔

''ارے یہ سب سرکاری لوگن کا کام ہے۔'' دینو جو اس بستی میں سب سے عقلمند مانا جاتا تھا بولا۔

''کون ہوت ہے یہ سرکار'' اس کی بیوی بولی۔

''ارے وہی جو پچھلے برس سیلاب میں دھوتی اور چاول باٹے رہی۔''

''ہمار دھوتی تو کب کی پھٹ گئی سرکار پھر نہ دینے آئی۔''

''تو ہار لوگائی کو اور دھوتی چاہی۔ جا سرکار سے بول آ'' نتھو ایک بے ڈھنگا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تو وہ ناراض ہوگئی۔

''کھانے کو تو کچھ دیا نہ۔ کرفیو الگ ٹھوس دیا۔ بالکن کل سے بھوکے ہیں۔''

''اس سے اچھا تو سیلاب ہی تھا۔ بھات بھی ملا اور دھوتی بھی۔'' فقیرے کی بیوی نے بولنا ضروری سمجھا۔

''تو نے بتایا نا کرفیو کاہے لاگا۔''

ہم بتاوت ہیں ہندو مسلمان فساد ہوگیا۔ سالے دس خلاص ہوگئے۔ ابھی دو دن تلک اور کرفیو لگا رہے گا۔'' دینو بولا تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پیسہ روپیہ آٹا بھات کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سماج کا سب سے پچھڑا ہوا طبقہ عام ہندوستانی بھی جن سے پیچھا چھڑاتے ہیں گندگی اور غلاظت میں گزر بسر کرنے والے..... ایک وقت پیٹ بھرنے والے

لوگ..... گندے چیتھڑے لپیٹتے جو انہیں کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ملتے تھے مگر دو دن سے سب کا ادھر جانا بھی بند تھا۔ ادھر کا ڈیوٹی پولیس دیکھتے ہی اپنا ڈنڈا جماتا بس دینو سے ہی اس کی دوستی تھی۔ ویسے دینو اس بستی کا سب سے امیر ترین آدمی تھا کباڑی تھا۔ مگر کام محنت سے کرتا۔ اس کے یہاں روز روٹی بنتی اور کبھی کبھار وہ ماس لے آتا تو اس کی بیوی چوسی ہوئی ہڈیاں بڑی شان سے کھولی کے باہر پھینکتی۔

"یہ بتا کرفیو کاہے لاگا۔ اور یہ ہندو مسلمان کاہے لڑے۔" بدری بے تابی سے بولا۔

"ارے ہندو مندر واسطے لڑتا ہے اور مسلمان مسجد کے لئے۔ سرکار لگائے دیا کرفیو۔ سسرے بندر ہو گے گھروں میں تو کیسے لڑو گے۔"

"تو کیا ہے رے دینو ہندو یا مسلمان" فقیرا نے سب کا دھیان بدلا۔

"مو ہے کیا معلوم۔ تو کیا ہے؟"

"پتہ نا۔"

"بدری توں، ہندو ہے کہ مسلمان"، "اور توں چندو، تو بتا۔"

"مجھے نا پتہ۔"

اس چھوٹی سی بستی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ کل کو اگر اس بستی پر حملہ ہو جائے تو کون کس کا ساتھ دے گا۔

اب تک یوں ہی بند پڑے اور بے کار دماغ میں ایک اتھل پتھل سی مچ گئی۔ بدری بہت چھوٹا تھا، اس کی ماں چوک پر بھیک مانگتی تھی وہ ماں کی گلی پھٹی ساڑی کا کونا تھامے گھسٹتا رہتا۔ تھوڑا اور بڑا ہوا تو ماں کے کہنے پر وہ ہر آنے جانے والے کا دامن پکڑنے لگا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے لوگ کچھ نہ کچھ جلدی سے دے کر آگے بڑھ جاتے۔ اور پھر ایک دن جب وہ کنارے بیٹھا نتھو حلوائی کی دی ہوئی روٹی کھا رہا تھا اور ماں چوراہے پر بھیک مانگ رہی تھی تو ایک تیز رفتار ٹرک نے اسے ٹکر مار دی۔ چاروں طرف بھیڑ اکٹھی ہو گئی وہ بے خبر روٹی کھاتا رہا اور کھا چکنے کے بعد جب چاروں طرف اس نے نظر دوڑائی تو ماں کہیں نہیں تھی، شہر کا بھیڑ بھاڑ کا علاقہ تھا اس لئے پولیس اور میونسپلٹی والے فوراً ہی اپنی

ڈیوٹی کرنے آ گئے اور لاوارث لاش لے کر چلے گئے۔ نتھو حلوائی کے کہنے پر وہ ادھر دوڑا مگر تب تک لاش جا چکی تھی۔ وہ کھڑا روتا رہا اور پھر دوسرے دن سے وہ نتھو حلوائی کا بندھوا مزدور بن گیا۔ دوکان بند ہونے پر وہ اس کی بنچ پر سوتا صبح نتھو دھکا دے کر بنچ الٹ دیتا وہ آنکھ ملتا ہوا وہاں کی صاف صفائی اور برتن دھونے میں لگ جاتا۔ بات بے بات نتھو حلوائی اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دیتا مگر اس کی آنکھ بچتے ہی وہ بھی گلاب جامن اڑا لیتا۔ عجیب بات تھی جب بھی وہ گلاب جامن مٹھی میں دباتا پچھلے چوراہے پر بھیک مانگنے والی کجری سامنے کھڑی اسے تکتی رہتی اور زبان ہلاتی۔ حلوائی ایک دن کہیں گیا ہوا تھا تو وہ ایک گلاب جامن کجری کو دے آیا پھر اکثر یہی ہوتا۔ ایک دن حلوائی نے اسے دیکھ لیا۔

''سالا خود تو مفت کی کھا رہا ہے ایک کو اور پکڑ لایا'' اور اس جرم پر اس کی اتنی پٹائی ہوئی کہ وہ پھر کبھی اس کی دکان کے سامنے بھی نہیں گیا۔ کجری کا خاندان پلیٹ فارم پر آباد تھا۔ وہاں اس کا وقت اچھا گزرنے لگا۔ بھاگتے مسافروں کی چیزیں اڑانا آسان ہوتا تھا۔ کئی بار پکڑا گیا۔ تین بار جیل بھی ہوئی۔ تیسری بار جب وہ چھوٹ کر آیا تو پلیٹ فارم خالی تھا۔ پتہ چلا کہ نئے اسٹیشن ماسٹر نے سب کو ہٹا دیا۔ باہر کجری بھیک مانگتی ہوئی اسے مل گئی اور روتے ہوئے بتایا کہ اس کی ماں بس اسٹینڈ پر بھیک مانگنے والے منگو سے اس کی شادی بنانے والی ہے اسی وقت دونوں بھاگ لئے اور بھاگتے بھاگتے اس بستی میں آ کر آباد ہو گئے۔ کجری کے سمجھانے پر وہ محنت مزدوری کرنے لگا۔ ہندو مسلمان بننے کا کبھی وقت ہی نہیں ملا اور اب اس فساد میں وہ کس کا ساتھ دے۔

''کیوں رے کجری تو ہے معلوم توں کیا ہے۔''

''مو ہے کا پتہ'' وہ بیزاری سے بولی۔

فقیرا ابھی رات بھر اسی ادھیڑ بن میں جاگتا رہا۔ مندر، مسجد اسے یاد آیا کہ وہ دونوں ہی جگہ سے صرف پھٹکار اور دھتکار ہی سنتا آیا ہے۔ بچپن میں وہ عید کے دن عید گاہ ضرور جایا کرتا تھا مگر مسجد کے اندر گھسنے کی کبھی اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ لوگوں کے سفید کپڑے دیکھ کر وہ خود ہی پیچھے کھسکتا رہتا اور آخر میں جب نماز شروع ہو جاتی تو وہ سب کی چپلیں پہن کر

دیکھتا رہتا زندگی میں یہی تو ایک موقع تھا۔ جب وہ اپنی ناپ اور پسند کی چپل اپنے انگوٹھے میں دبالیتا اور پھر جب نمازی باہر نکلتے وہ اپنے رٹے رٹائے جملے دہرانے لگتا۔

''اللہ ایسی عیدیں بار بار لائے۔ سرکار کے بچے کھس رہیں۔ افسر بنیں بابو بنیں۔''

''سالا یہ عید روز روز کیوں نہیں آتا۔'' پیٹ بھر کھانے کے بعد وہ لمبی سے ڈکار لیتے ہوئے سوچتا۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، اس کا مانگنے کا دھندا ڈاؤن ہوتا گیا لوگ حقارت سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

''جوان ہو کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے۔ مفت کی روٹی ہاتھ لگتی ہے۔'' اور اب اکثر کھانے کے بجائے ایسے ہی جملوں سے اس کا پیٹ بھرنے لگا۔ چربی تو واقعی اس کے جسم پر جم گئی تھی۔ عجیب کاٹھی تھی کی کئی روز کا فاقہ بھی اس کے گٹھیلے جسم پر کوئی اثر نہیں دکھاتا اور وہ بانکا جوان نظر آتا اور اس کی یہی جوانی دیکھ کر بجلی گھر کے پاس بیٹھے موچی کی لڑکی دھنیا اس پر عاشق ہوگئی۔ اور ایک دن دونوں بھاگ لئے۔ اور بھاگتے بھاگتے انہیں اس بستی میں پناہ مل گئی۔ بیڑی سلگاتے ہوئے دیکھ دھنیا سلگ گئی۔

''مسٹنڈے یوں ہی پڑا رہے تو مجھے کاہے کو بھگا لایا دو جون سے روٹی نہ ملی۔''

ایسا حال بستی کے سارے مردوں کا تھا۔ کام دھام نہ کرتے تھے اور نہ ہی ملتا تھا۔ اور جو کبھی پانچ دس روپے کما لیتے تو دیسی شراب کے اڈے پر شراب میں بدمست جھومتے اور چاند تاروں کے خواب دیکھتے رہتے۔

''رات بھر اڈے پر رہا اب کیا پورے دن سوئے گا۔'' چندو کی بیوی ۷۵ چھیدوں والی چادر اس کے اوپر سے کھینچتے ہوئے بولی۔

''اے ہے کون سا خزانہ مل گوا کی رکھوالی کرتے رہے۔''

''اے بیٹھ نا۔ توں بتا توں کیا ہے ہندو یا مسلمان۔ پورے شہر میں فساد پھیلا ہے ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔'' پہلی بار اسے اس طرح بولتے دیکھ کر دھنیا بیٹھ گئی۔

''اب مو ہے کیا معلوم۔ مائی تو پیدا کرتے ہی مر گئی۔ باپ کا دھرم ایمان سب شراب تھا۔ وہی جہاں سے توں مجھے بھگا لایا۔ دو جون کی روٹی کا لالچ دے کر جو کبھی نہ ملی۔''

''اب وہ سب چھوڑ یہ بتا ہم کس کا ساتھ دیں۔''

''وہ پھیکٹری کی لوگائیاں گنگا ماں کی پوجا کرت ہیں دیا جلاوت ہیں سو ہم بھی جلائے لیت ہیں اور پچھلے مہینے جب چھنکا بہت بیمار تھا۔ تاپ زور کا رہا دست رکت نہیں رہا تو مینا کی کہنے پر گاؤں کے پیر بابا کی مزار پر منت مان آئے رہیں۔ چھنکا تو ٹھیک ہو گوا مگر اب تک منت پوری نہ ہوئی۔ کتنی بار کہا ہے تم سے دو روپیہ الگ سے دے دو۔ منت پوری کر آئیں۔''

''ہم تو سے ہندو مسلم کی بات کرے ہیں اور توں ہے کہ پیسہ کے واسطے منہ پھیلا دی چل ہٹ۔''

بچپن سے اب تک کی کوئی کڑی ایسی نہیں مل رہی تھی جس سے وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کا فیصلہ کر سکتا۔ کچھ بھی ہو۔ مگر ایک بات طے تھی یہ دینو ضرور مسلمان ہو گا محرم میں بڑے امام باڑے پورے مہینے جاتا ہے۔ سبیل پی پی کے کیسا نکھر جاتا ہے سالا۔ مگر اس کے مسلمان ہونے پر اس کے اپنے بارے میں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔

''ارے چندو سوتا ہے کیا بے'' دکھیا اس کی کھولی میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''نہیں بھئی نیند اڑ گئی ہے۔''

''وہی سوچت ہو کیا جو ہم سوچ رہے ہیں۔''

''تم کیا سوچت ہو بھائی ہمیں کیا معلوم۔''

دکھیا چندو کی بیڑی کا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ''ارے وہی ہندو مسلمان۔''

''اچھا یہ سوچ دکھیا نام کا ہے پڑا تورا۔

''اب ہمیں زیادہ کچھ تو نہیں معلوم ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ باپ تو ہمار سدا کھٹیا لگا رہا اور ماں گھروں کے کام کرتی تھی سو ہم ماں کے ساتھ لگ جاتے رہیں۔ مگر کوٹھی والوں کو اعتراض ہوتا ہم ویسے بھی بیمار رہا کرتے تھے زیادہ۔ سو سب کہتے کہ دکھیا ہے یہ دکھیا۔ کوئی نہ کوئی دکھ ہمیشہ ہی لگا رہت ہے اس کو۔ باہر ہی کھڑا رکھا کر سو ہم باہر ہی رہتے رہے اور ایک دن وہاں جب بس رکی تو ہم اس پر چڑھ گئے ادھر ادھر گھوم کر جب بس رکی اور سب لوگ اتر گئے تو ہم اکیلے بچے کنڈکٹر وا پوچھت نام کا ہے تمہارا۔ تو ہم بول گئے دکھیا اور جب سے ہم

دکھیا ہی ہو گئے۔ ماں پھر کبھی ہم کو نہ ملی۔ اور پھر ادھر ادھر پٹتے پٹاتے یہاں آ کے بس گئے۔ تو کچھ سکون ملا۔ مگر اب سُسر اپنا بکھیڑا شروع ہو گوا" وہ جمائی لیتا ہوا اپنی رام کہانی سنا گیا۔

"توری بات سے بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ اب کا ہوئے۔"

پوری بستی میں ایک کھلبلی سی مچی تھی۔

"ویسے ایک بات ہے یہ دینو ضرور مسلمان ہے۔" چندو بدری کے کان میں بولا۔

"کیسے۔"

"ارے پورے مہینے امام باڑے کے چکر لگاوت نا ہی دیکھا۔"

"ای کوئی بات ہوئی۔ رام لیلا کے پیچھے کیسے دیوانہ رہت ہے ای بھول گئے۔ اب کی سال تو اسے ڈھول بھی مل گئی رہی۔ بجاوت ہم دیکھے رہیں۔ اور تو اور راون کا جلاوے میں خود ہی جل گوا رہا۔"

"ہاں ای بات تو ہندو مسلمان کے چکروا میں ہم بھول ہی گئے۔" روٹی پیٹ کی بات بھول کر پوری بستی انہیں سوالوں میں گم رہی۔ سب کے بچپن کی کہانی ایک سی تھی۔ کچھ یاد تھا تو پیٹ سے جڑی کہانیاں...... روٹی...... زندگی کی حقیقت...... جس کے لئے ان کے گھر خاندان سب چھوٹ چکے تھے۔ بستی میں سب سے بزرگ ہریا تھا مگر پتہ نہیں کب سے وہ فالج میں پڑا تھا اور دن بھر مکھیاں اسے گھیرے رہتیں۔ دینو کی ماں پاگل تھی اور روٹی دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ جاتی اور آج شاید صرف وہ ہی تھی جو بستی والوں کی پریشانی سے بے فکر ریلوے لائن پر بیٹھی گاڑی آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ورنہ سگی ماں یہی بستی تھی۔ جس نے بغیر کسی پہچان کے ان کو پناہ دی تھی۔ سب اس کے بچے تھے لڑتے جھگڑتے بھی تھے اور سب کے دکھ سکھ کے ساتھی بھی تھے۔ دنیاوی رسم و رواج سے پرے۔ مگر شہر کی اس فضاء نے ان کی زندگیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ سب سوچ وچار میں گم تھے اور آخر میں طے پایا کہ چندو، فقیرا، بدری اور دینو چاروں پاس کے گاؤں والے ماسٹر جی سے اپنے مسئلے کو حل کروائیں۔ ایک تو وہ پڑھے لکھے تھے دوسرے اس بستی کی مدد کے لئے اکثر آ گے آتے رہتے۔ کرفیو لگا ہوا تھا اس لئے بچتے بچاتے کسی نہ کسی طرح وہ ماسٹر جی تک پہنچ گئے۔

ماسٹر صاحب نے بڑے صبر سے ان کے مسئلے کو سنا۔ پرانے واقعات جو ان کی زندگیوں سے جڑے تھے انہیں جانا۔ مگر کہیں سے کوئی بھی کڑی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔

''ایک تو تم لوگوں کے نام ایسے ہیں کہ کوئی مطلب نہیں نکالا جا سکتا۔ کسی مذہب کے بارے میں تمہیں کوئی جانکاری نہیں ہے۔ پوجا پاٹھ تم نے کبھی کیا نہیں۔ مسجد کے باہر بھیک مانگنے سے یا بیبل پینے سے تو کوئی مسلمان ہو نہیں جاتا اور نا ہی کسی کی دیکھا دیکھی گنگا جی میں نہانے سے یا رام لیلا میں جانے سے کوئی ہندو ہو جاتا ہے۔ میری تو عقل پریشان ہے۔ اب نام بھی ایسے ہیں تم لوگوں کے۔ چندو سے چاند بھی ہوتا ہے اور چندر بھی ہوسکتا ہے، اسی طرح بدری ہے، اب بدری پرساد ہو تو ہندو ہو سکتے ہو اور بدرالدین ہو، تو تم مسلمان۔ یہی حال دینو کا ہے۔ دینا ناتھ، یا رام دین بھی ہو سکتا ہے اور دین محمد بھی۔''

''میرا ماسٹر جی'' فقیرا جلدی سے بولا۔

''تمہارا بھی وہی حال ہے۔ فقیر چند بھی ہو سکتا ہے اور فقیر محمد بھی۔ تم میں سے کون مسلمان ہے اور کون ہندو۔ یہ فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں اور اس سے تو اچھا یہ ہے کہ تم ان باتوں کو چھوڑ و اور اپنے حالات سدھارنے کی کوشش کرو، محنت کرو، کماؤ اور اپنے بچوں کو پڑھا کر اچھا انسان بناؤ۔''

''ارے پڑھ کر کیا تم بابو بنا دو گے صاحب بنا دو گے۔ خود تو بھوکے مر رہے ہو اور ہمیں بھاشن۔''

''چپ کر دینو...... ماسٹر جی کو کیا کہہ رہا ہے۔'' بدری نے اسے باہر کھینچا۔

''خوانخواہ لڑ رہے ہو ان سے۔ وہ تو تمہاری بھلائی کی خاطر۔''

''بھلائی سالا پورا شہر لڑ مر رہا ہے اور یہ ہمیں بھلائی سکھا رہا ہے۔ ہم ہندو ہیں کہ مسلمان...... یہ تک تو بتا نہیں سکا۔''

''اب کچھ دھندے کی فکر کر۔ کل سے روٹی نہیں دیکھی۔'' نالے سے پانی پیتا فقیرا بولا۔

''ارے یہ دیکھ سامنے پولس بابو اپنا یار ہے۔ چل سالا اس سے پوچھیں۔'' ایک

زوردار سلام مار کر دینو نے اپنی بیڑی اس کی طرف بڑھائی۔

''کہو صاحب کرفیو کب تلک کھلے گا۔''

''سالا جھگڑا تھمے تو کرفیو کھولنے کے بارے میں سوچیں۔'' وہ اکڑا،

''سنا ہے سنار بازار میں دو مسلمان مارے گئے اور لوہار گلی کے پیچھے کے دو ہندو غائب ہیں۔ان کی تو لاش بھی نہیں ملی۔اسی لئے ٹنشن زیادہ ہے۔'' دو ہندو مرے اور دو مسلمان۔اور سالا ہمیں پتہ ہی نہیں کہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان ورنہ دو چار کو ہم بھی خلاص کر ہی دیتے۔چندو دل ہی دل میں سوچتا رہا اور کڑھتا رہا۔تبھی پیچھے سے پولیس جیپ آ کر رکی۔ چاروں گھبرائے مگر پولیس والا دینو کا یار تھا۔اس لئے کھڑے رہے۔کانسٹبل نے جیپ سے اترتے ہوئے انسپکٹر کو سلوٹ کیا۔

''کون ہیں یہ سب'' انسپکٹر نے فقیرے کی بیڑی سے کش کھینچا۔''پاس کی جھگی والے ہیں صاحب۔ذات کی چھوڑیں دھرم بھی نہیں معلوم اسی تلاش میں نکلے ہیں۔''

''گیانی ملا بننے نکلے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''لوہار گلی والے لڑکوں کی لاش اب تک نہیں ملی۔اور شام تک اگر باڈی نہیں ملتی تو وردی اتری۔ ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔اب لاش کیا زمین کھا گئی یا آسمان عجیب مصیبت ہے۔'' لمحے بھر کے لئے وہ رکا۔''کیوں نا ان کو بھی اوپر پہنچا دیں سب دھرم کرم سامنے آ جائے گا۔''

ایک آنکھ دبا کر اس کا بے ہنگم قہقہہ فضا میں گونجا چاروں گھبرائے اور بھاگنے کے لئے مڑے ہی تھے کہ گولیوں نے اس ویران اور سنسان جگہ ان کا کام تمام کر دیا۔

ندی کے اس پار دو جوانوں کی کچلی ہوئی لاشیں ملیں جن کو پہچاننا ناممکن تھا مگر انسپکٹر کے دعوؤں نے ثابت کر دیا کہ یہ لاش لوہار گلی کے لڑکوں کی ہے۔پولیس کی موجودگی میں چند گھنٹوں کے اندر ان کا انتم سنسکار کر دیا گیا۔کرفیو دو دن کے لئے اور بڑھ گیا بستی والے چاروں کے غائب ہونے سے پریشان تھے اور ادھر نالے میں پڑی گلی سڑی دو لاشوں کے ملنے سے شہر میں کشیدگی اور پھیل گئی تھی۔ ہندو مسلم دونوں لاشوں کی شناخت میں جٹے اپنے اپنے اوزار صاف کر رہے تھے۔

☆☆

دُھند

''امی ادھر چلو دیکھو۔'' میری دس سالہ کپڑوں کی بے حد شوقین بیٹی صبا نے میرا ہاتھ کھینچا۔ ''صبا تم بھی...... یہ کیا طریقہ ہے۔'' کافی دیر سے مختلف کپڑے دیکھنے کے بعد میں کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والی تھی کہ اس کی دخل اندازی مجھے بے حد بری لگی۔ وہ ضدی ہے اس لیے مجھے فوراً اس کے ساتھ چلنا بھی پڑا۔

''کیا دکھانا ہے۔'' شہر کے مشہور شاپنگ مال کے دوسری طرف چلتے ہوئے میں نے صبا سے پوچھا۔؟ ''امی...... اتنا اچھا بڑا کپڑا...... چمک دار......'' میرے سامنے آ کر پیچھے کی طرف چلتے ہوئے اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکالیں۔ مجھے بھی تجسس نے گھیرا۔

''یہ......'' میرے لہجے میں ہنسی کے ساتھ مایوسی تھی۔

سرخ رنگ کا بروکیٹ کا غرارہ...... اس کے ساتھ سادی قمیص اور گوٹے کنارے سے لیس لمبا چوڑا دوپٹہ...... تیز روشنی میں کرنیں بکھیرتا چم چم کرتا...... ہر کسی کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

''امی یہی لو نا میرے لیے۔'' صبا نے لاڈ سے میرا ہاتھ کھینچا۔

''تم پہنو گی اسے'' مجھے ہنسی آ گئی۔ اسمارٹ سی چاق و چوبند سیلز گرل مسکرائی۔

"میڈم یہ سیل میں نہیں ہے۔antique piece۔" "اوہ" مجھے لینا نہیں تھا مگر اس کے کہنے پر افسوس ضرور ہوا۔

آج کل کی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں casual dressing صرف فیشن ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔گھر آ کر صبا نے ضد کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔سمجھانے بجھانے سے لے کر بات ڈانٹ اور تھپڑ تک پہنچ گئی، مگر اس کی ضد قائم رہی۔میں دکان دکان گھومی...... درزی کے چکر لگائے، مگر سب بیکار۔میٹروسٹی میں کوئی ایسا نہیں ملا جو میری بیٹی کی خواہش پوری کر دیتا۔صبا کی چھٹیاں ہو گئیں، نانی کے گھر جانے کی خوشی اور سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں وہ اپنی ضد بھی شاید بھول گئی تھی۔ مجھے سکون ہوا...... امی کے ساتھ باتوں کا دور چلا، شادی بیاہ کی بات پر غراروں کی بات نکلی اور میں نے اس سے صبا کی خواہش کا ذکر کر دیا۔

"......تم کو گل ناز بیگم کے غرارے یاد ہیں؟" ...... گلناز بیگم...... مجھے اپنے دماغ پر زور ڈالنا پڑا...... اور پھر جھلمل لہراتے...... ست رنگی روپٹے کی لہریں ایک کے بعد ایک سامنے سے گزریں، مگر بے حد دھندلی...... کوئی واضح تصویر سامنے آتی بھی تو کیسے...... میں تو اس وقت شاید صبا سے بھی چھوٹی تھی...... مگر وہ تجربہ اتنا دلچسپ تھا کہ امی کو ازبر تھا اور ان کے یاد دلانے پر مجھے بھی کل کی بات کی طرح سب کچھ یاد آتا گیا۔کم عمری اور ناسمجھی کے باعث جو باتیں میری عقل سے اس وقت پرے تھیں اب وہ صاف تھیں۔میرے نانا سرکاری افسر تھے اور امی کے مطابق ان کی فیملی انگریزی تعلیم اور رکھ رکھاؤ کے باعث خاندان کے دوسرے افراد سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھی۔امی اور ابو دہلی کے ایک کالج میں ہم جماعت تھے اور شادی کے بعد وہیں نوکری بھی کرنے لگے۔امی کی خالہ اچانک بیمار پڑیں تو وہ مجھے لے کر انہیں دیکھنے علی گڑھ کے پاس واقع چھتاری آئیں۔خالو نواب صاحب کے منشی تھے اور حویلی کے باہر احاطے میں بنے ایک مکان میں رہتے تھے۔وہ شاندار اونچی دروں اور محرابوں والی حویلی...... جسے دیکھ کر ہی راستے کی ساری تھکان مٹ گئی۔اندر سے پتہ نہیں کیسی ہوگی۔تجسس اس وقت ٹوٹا جب میں باہر سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔کوئی زور سے چیخا۔اور میں گھبرا کر غلطی سے اندر کی طرف تیزی سے بھاگی۔

''اوئے رک......کون ہے کہاں سے گھسی آرہی ہے؟'' ہرے رنگ کے فرشی غرارے......لہردار دوپٹے میں ملبوس لمبی سی چوٹی ہاتھوں میں تھامے دوبارہ ویسی ہی آواز آئی۔ حلیے اور لہجے میں موجود تضاد نے مجھے اس وقت بھی چونکا دیا تھا۔ وہ میرے قریب آئیں......تکبر سے اپنی چوٹی کو جھٹکا......میں گھبرا کر پیچھے ہٹی عجیب وحشت ہوئی۔

''آپا جانی......آپا جانی'' میری ہی ہم عمر ایک بچی ان سے آکر لپٹ گئی۔

''رخسار دیکھونا......شاید کوئی بھکارن ہے غلطی سے اندر تک آگئی۔''......

''میں......منشی جی کے یہاں آئی ہوں دلی سے۔''

''دلّی سے'' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا......''اوہ......ہم سمجھے......پہلی بار دیکھا ہے نا اس لیے۔'' دونوں نے غرور سے گردن اکڑائی۔

''تمہاری امی بھی ساتھ آئی ہیں......وہی جو پڑھاتی ہیں ماسٹرنی۔''

''میری امی کالج میں پروفیسر ہیں۔'' اپنی بے عزتی تو میں نے برداشت کر لی تھی مگر بات ماں کی تھی تو میری زبان خود بہ خود کھل گئی اور اعتماد بھی بحال ہو گیا۔

''ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں......جاؤ انہیں بلا لاؤ۔'' غصہ تو بہت آیا مگر وہاں سے جانے کا موقع ہاتھ لگا۔ میں مڑی......مگر اس سے پہلے کہ بھاگتی میں نے امی کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ خوبصورت ساڑی میں میری ماں مجھے بے حد حسین لگیں۔ ان کا اپنا ہی ایک اسٹائل ہے۔ وہ لوگ بھی حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے گردن اکڑائی۔ رخسار میرے قریب آئی۔

گلناز بیگم امی کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ خاطر داری اور رسمی بات چیت کے بعد انہوں نے بے حد رازداری سے امی سے پوچھا؟ ''آپ انگریزی جانتی ہیں۔''......

''ہاں......انگریزی ہی میرا مضمون ہے۔'' وہ کیا سمجھیں معلوم نہیں مگر یکا یک مرعوب سی نظر آنے لگیں۔ ''بول کر دکھاؤ۔''

''کیا؟''

''کچھ بھی'' ان کے اصرار پر امی نے شیکسپیئر کے ڈرامے کی چند لائن Life is

سنائی۔ پھر اس کا ترجمہ بھی کیا۔ ''مجھے بھی ایسے ہی انگریزی بولنا سکھاؤ۔'' like a stage
لہجے میں رعب تو تھا مگر لجاجت کے ساتھ ایک معصوم سی خواہش بھی تھی۔ امی انکار نہیں کر سکیں
اور ہاں میں سر ہلایا۔

''وہ اسلم شیرازی ہیں نا میرے چچازاد...... میرے منگیتر ہیں۔ لندن میں ہیں، وہاں انگریزی ہی تو بولتے ہوں گے۔'' ان کی کشمکش امی شاید سمجھ رہی تھیں اور ان کو انگریزی پڑھانے کا ذمہ لے لیا۔ کسی بھی کام میں خواہش کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں تو انسان کتنا حساس ہو جاتا ہے، یہ احساس انہیں گلناز بیگم کو پڑھانے میں ہوتا۔ گرامر اور tense وہ سمجھنے لگی تھیں۔ اور پڑھایا ہوا سبق دوسرے دن پھٹا پھٹ امی کو سنا دیتیں۔ سبق ختم کرنے کے بعد وہ ایک طرح سے حکم دیتیں کہ امی فر فر انگریزی میں کچھ بولیں۔ وہ کچھ بھی ادھر ادھر کا سناتیں۔ اور گلناز بیگم انہیں ایسے دیکھتیں جیسے وہ وہ نا ہو کر اسلم شیرازی ہوں...... انہیں جھر جھری سی ہوتی اور کاغذ قلم سمیٹ کر عجلت سے باہر آ جاتیں۔ گلناز بیگم کے لیے اسلم شیرازی ایک centripetal force کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کی جانب وہ وقت کے کھنچتی جا رہی تھیں۔

''ارے حنا بیٹا...... ہمارے پاس آؤ۔'' گلناز بیگم کی والدہ نے امی کو آواز دے کر روک لیا۔

''ادھر آؤ...... دیکھو یہ اور بتاؤ کیسا ہے۔'' پھر خود ہی بولیں ''خالص زری کا ہے ...... سونے اور چاندی کا کام الگ...... بنارس کے خاص کاریگروں سے بنوایا ہے...... وزن تو دیکھو...... اٹھاؤ۔''

''اچھا ہے...... بہت اچھا۔'' امی نے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''ہمارے خاندانی غراروں کی یہی خصوصیت ہے کہ اٹھانے کے لیے خدمت گار درکار ہوتے ہیں۔'' امی اب واقعی مرعوب ہو گئی تھیں۔

''یہ دیکھو......'' کڑھائی کے فریم میں لپٹا سرخ رنگ کا کپڑا انہوں نے امی کی طرف بڑھایا۔ رنگ برنگے سچے موتیوں سے کاڑھے گئے پھول اصل ہونے کا گمان دے

رہے تھے۔

''ہماری گلناز کا کمال ہے۔اس کی ضد ہے کہ چوتھی کا غرارہ وہ خود کاڑھے گی۔ بس اب تو اسلم میاں کی تعلیم ختم ہونے کا انتظار ہے تا کہ نکاح کی رسم پوری کی جاسکے۔''

''جی بہت اچھا ہے۔'' امی اور کیا کہتیں۔

''گلناز بتا رہی تھیں کہ تم نے کالج کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد وہیں نوکری کر لی ہے۔'' ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ نوکری نہیں بلکہ کوئی جرم کر رہی ہوں۔ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کئی دنوں سے سوچی ہوئی بات امی نے ان سے کہی۔'' گلناز کو پڑھنے کی لگن ہے، ذہین بھی ہیں آپ ان کے اس شوق کو آگے بڑھایئے، میں ان کی پوری مدد......''

''تا کہ دو چار کتابیں پڑھ کر بڑوں سے بات کرنے کی تمیز اور تہذیب بھی بھول جائے......اور بحث کے لیے بڑوں کے سامنے کھڑی ہو جائے......ہمت نہیں ہے کسی کی جو ہمارے سامنے اونچی آواز سے بات کر سکے اور تم ہم کو بتا رہی ہو کہ......''

''انجانے میں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتی ہوں......مگر اب زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے اور......''

''ہم بدلتے ہیں زمانہ۔گلناز کو ہم نے وہ تمام تعلیم و تربیت دی ہے جو اس کی زندگی بہتر بنا سکے۔ہمارے یہاں کے مرد عورتوں کی کمائی پر گزارہ نہیں کرتے۔اللہ عمر دراز کرے اسلم شیرازی کی......علم و ہنر میں یکتا ہیں اور وہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ بیوی کی ہر خواہش زبان پر آنے سے پہلے پوری کر سکیں۔''

''اسلم شیرازی اور گلناز بیگم......کیا زبردست جوڑی ہوگی ان دونوں کی...... ہے نا امی ویسے کیا کلاس لی آپ کی بیگم صاحبہ نے......وہ تو شکر کریں انگریزی کا۔جو گلناز بیگم آپ کے رعب میں آگئیں ورنہ......واہ واہ انگریز چلے گئے مگر رعب ڈالنے کے انگریزی چھوڑ گئے جو آج تک کام آ رہی ہے۔''

''مسلمانوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ کسی بھی تبدیلی کو وہ بہت جلد اور بہت آسانی سے قبول نہیں کرتا......بلکہ روایت اور اصول کی آڑ میں اپنی آنے والی نسلوں کو

دوسروں سے بہت پیچھے کر دیتا ہے۔ ہر تبدیلی کے منفی اثرات اس پر اس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ مثبت پہلو اجاگر ہی نہیں ہو پاتے......''

''یعنی......سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا۔'' امی کے لمبے ہوتے لکچر کو بریک کی ضرورت تھی۔ وہ تھوڑا جز بز ہوئیں ''ارے سنو منشی جی کی پوتی نوری کل اپنی بیٹی کے داخلے کے لیے علی گڑھ جا رہی ہے تم بھی چھتاری چلی جاؤ اس کے ساتھ......صبا کے لیے غرارہ بھی بنوا لینا اور گلناز بیگم کے جادہ جلال کو بھی دیکھ لینا۔''

گلناز بیگم سے ملنے کی حسرت دل میں لیے میں جس جذبے سے چھتاری پہنچی تھی وہ راستے میں ہی بکھر گیا۔ ویران اور سنسان حویلی کے ایک طرف نئے تعمیر شدہ مکان میں نوری کی بھابھی نے ہمارا استقبال کیا۔ چائے ناشتے کے بعد میں نے حویلی کے متعلق پوچھا۔

''میں تو دو سال سے یہاں ہوں۔ سنا ہے حویلی برسوں سے بند ہے۔ مقدمہ چل رہا ہے لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں مجھے تو ادھر سے گزرنے میں بھی ڈر لگتا ہے۔ سنا ہے وہاں بھوتوں......اور''

'وہاں کے مکین'' میں نے بیچ میں اسے روکا۔

''ان کا تو پتہ نہیں ادھر پچھواڑے کی ڈیوڑھی میں دو عورتیں رہتی ہیں۔ انہیں شاید معلوم ہو مگر وہ کسی سے ملتی جلتی نہیں۔'' ان لوگوں کو ضرور معلوم ہوگا۔ پلیٹ میں مٹھائی لے کر دینے کے بہانے میں باہر آئی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں نے کھٹکھٹانے سے پہلے جھانکا دونوں عورتوں کی پشت میرے جانب تھی۔ نقش دار پلنگ پر بیٹھی عورت زور زور سے کچھ بول رہی تھی۔ دوسری نل کے پاس بنے حوض پر برتن مانج رہی تھی۔ میں نے دروازے کی کنڈی بجائی۔

''ارے رخسار دیکھ ذرا کون ہے......کوئی مانگنے والا ہوگا......دے دے کچھ......'' کرخت سی آواز باہر تک آئی۔ ''قارون کا خزانہ ہے یہاں' بولتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

یہ رخسار تھی......وقت کی دھول نے اس کے جسم کے ساتھ اس کی یادداشت کو بھی شاید دھندلا کر دیا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد اس نے خود پر ایک نظر ڈالی۔ چہرے کے آؤ بھاؤ

تیزی سے بدلے۔ ''کیا ہے'' بڑا ہی ترش لہجہ تھا۔ ''پڑوس سے آئے ہیں......یہ......'' ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں نے آگے بڑھائی۔ ''کون ہے'' پلنگ پر بیٹھی عورت مڑی۔

''پڑوسی ہیں'' جیسے ہی وہ مڑیں میں آگے بڑھی۔ وقت کا پہیہ تیزی سے پلٹا...... قریب 25 سال...... 25 سال شاید بہت کم ہوتے ہیں...... کسی بھی تبدیلی کے لیے...... یا بہت زیادہ...... حساب میں مَیں ہمیشہ کمزور تھی...... وقت خود اپنے اندر انقلاب کی قوت رکھتا ہے۔ ایک برس لمحوں میں بیت جاتے ہیں تو کبھی ایک لمحہ برسوں کے مانند گزرتا ہے بھاری قدموں سے میں ان کی جانب بڑھی۔ مجھ سے بے خبر وہ پلیٹ ہاتھ میں لیے تیزی سے مٹھائی کھا رہی تھیں۔ پلنگ کے دوسرے جانب کڑھائی کے فریم میں لپٹا سرخ کپڑا رکھا تھا۔

''اسلم شیرازی کہاں ہیں'' میں نے رخسار کا ہاتھ تھاما ''وہ ایک بار یہاں آئے تھے مگر ان کی انگریز بیوی کو اس گھٹن بھرے ماحول میں سانس لینا دشوار تھا اس لیے وہ......'' اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا۔ میں باہر جانے کے لیے مڑی۔ گلناز بیگم بچی ہوئی مٹھائی تیزی سے کھا رہی تھیں۔ رخسار نے میلے دوپٹے کے کونے سے اپنی آنکھیں پوچھیں۔

''Antique Piece'' بڑے سے شاپنگ مال میں مسکراتی ہوئی sales girl کہہ رہی تھی۔

☆☆
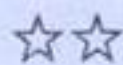
تم کون

بھولے بھالے چندر پرکاش عرف چندو نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان نہ صرف اوّل نمبر سے ہی پاس کیا بلکہ آس پاس کے گاؤں کا اب تک کا ریکارڈ بھی توڑ دیا، مگر اس کے گھر والوں کے لیے یہ خبر خوشی سے زیادہ فکر کی ثابت ہوئی۔ ماسٹر جی سے لے کر گاؤں کے پردھان تک ان کے گھر مبارکباد دینے آئے۔ مٹھائی اور چائے پانی میں پہلے تو اس کی ماں کے آنچل میں مڑا تڑا روپیہ ختم ہوا ہی بکسے میں رکھی پوٹلی بھی کھولنی پڑی۔

''بندو نے پانچویں کی پڑھائی کی تھی مگر امتحان نہیں دیا۔ کھیت میں باپو کے ساتھ لگا رہا۔ پچھلے ساون بیاہ بھی ہو گیا۔ اور اب اس کی بیوی امید سے ہے اوپر والے کا سہارا رہا تو یہ بیڑا بھی پار ہو جائے گا مگر ایسی چنتا تو نا ہی ہوئی۔''

اس کے بعد کے دونوں لڑکے بھی کام سے لگے تھے۔ مگر چندو کی اس کامیابی نے اس پریوار کو روٹی سے آگے کا راستہ دکھا کر چنتا میں ڈال دیا۔ کیا کیسے ہوگا، سب کی سمجھ سے پرے تھا۔

اسکول کے منیجر نے چندو کے اندر چھپی صلاحیت کو تاڑ لیا۔ اس کے ماں باپ کو اس کی طرف سے بے فکر ہو جانے کو کہا اور دلّی میں اپنے بیٹے کی نگرانی میں اسے پڑھنے کے

لیے بھیج دیا۔

''لڑکا ہونہار ہے اور محنتی بھی۔لمبی ریس کا گھوڑا ثابت ہوگا۔'' انہوں نے ایک ماہر معاشیات کی طرح لانگ ٹرم انوسٹمنٹ(Long term investment) کا حساب بنایا اور اپنے بیٹے کرشن کانت کو بیٹی کے سنہرے مستقبل کا خواب معہ تعبیر کے دکھایا۔جس کے عمل میں انہوں نے اسے ایک کوچنگ سینٹر میں داخلہ اور پاس کی ایک لاج میں رہنے اور کھانے کا بندوبست بھی کردیا۔چندو نے آنسوؤں سے تر اپنا چہرہ دھویا،سب کے پاؤں چھوئے اور اپنا بکس اور تھیلا لے کر ایک شاندار مستقبل کا خواب سجائے ایک نئے راستے پر چل دیے۔کمرے میں ایک اور لڑکے کو آنا تھا۔چندو نے بستر بچھایا،بکس کو تخت کے نیچے کھسکایا۔پاس پڑی میز کو جھاڑ پونچھ کر درست کیا اور رام جی کی فوٹو سجادی۔ماں نے روز پوجا کرنے کے لیے کہا تھا۔انہیں یاد آیا۔ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور بھگوان جی کی یاد میں کھوئے ہی تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔آنکھ کھولی،دھڑ دھڑاتے دل کو قابو میں کیا اور دوسری طرف نظر دوڑائی۔ایک دبلا پتلا لڑکا اپنا سامان رکھ رہا تھا۔ہاتھ جوڑ کر چندو نے نمسکار کیا اور پھر پوجا میں مشغول ہوگئے۔

''یہ......'' انہیں یکا یک ایک خیال آیا اور اندر تک کانپ گئے۔چاچا جی نے کس جنم کا بدلہ لیا ہے......وہ ٹھٹکے......اس گھڑی کو کوسا جب شہر آکر بڑا آدمی بننے کا سپنا دیکھا تھا......مگر اب یہ مسلمان؟ایک مسلمان کے ساتھ وہ ایک کمرے میں بھلا کیسے رہ سکتے ہیں۔انہوں نے بھگوان جی کی طرف دیکھا اور دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے بستر پر جم گئے۔پہلی بار گھر سے دور ہونے کا غم ہوا ہو گیا اور ایک عجیب سے ڈر نے آگھیرا۔اب کیا ہوگا.....؟

''میرا نام رحمان ہے۔ایم۔اے میں داخلہ لیا ہے۔ساتھ ہی کسی وزگار کی تلاش میں بھی ہوں تاکہ اپنے اس دبلے پتلے جسم کا بوجھ اٹھا سکوں۔''

وہ ہنسا،مگر چندو کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر ہی رکی رہی۔ان کے شک کو اس نے یقین میں بدل دیا تھا۔گھبرائے گھبرائے سے چندو نے پہلی بار براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔دبلا پتلا جسم......سانولی رنگت......جسم سے میل کھاتی ہلکی ہلکی

داڑھی...... پتہ نہیں قدرتی تھی یا اسے کاٹ چھانٹ کر جسم سے میچ کیا گیا تھا۔ ملنسار لہجہ......
مگر اس کی یہ خوش مزاجی پتہ نہیں چندو کے لیے کیا رنگ لائے۔ ایک بار پھر انہوں نے دل ہی دل میں بھگوان جی کو یاد کیا اور بستر پر گر گئے۔

''میرے پاس کھانا ہے آؤ کھالیں، ماں کے ہاتھ کی روٹی پتہ نہیں اب کب نصیب ہو۔''

ان کا ڈر جائز تھا پتہ نہیں اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ لاج میں کھانے کا انتظام تھا اور چاچا جی نے چھ مہینے کا پیسہ اور کرایہ ایک ساتھ جمع کر دیا تھا۔ وہ کھانے کے بہانے باہر نکل آیا۔ کتنی گھٹن تھی اندر...... کیا کرے...... مالک سے کہہ کر کمرہ بدلوالے...... مگر پھر بھی رہے گا تو وہ یہیں...... کسی اور جگہ کے بارے میں اسے کوئی علم ہی نہیں...... پھر پیسے کا بھی سوال ہے...... مالک اتنی آسانی سے پیسہ واپس نہیں کرے گا...... چاچا جی کب آئیں گے نہیں معلوم؟ کیا کرے...... لڑکا سمجھ دار تو تھا ہی...... خود ہی سوال جواب کرتے ہوئے کھانا کھایا تھوڑی دیر ٹہلا۔ تھکان بھی تھی اور گاؤں میں جلدی سونے کی عادت...... وہ کمرے میں آیا۔ رحمان کھانا کھا کر برتن رکھ رہا تھا۔

''کھانا کھالیا'' وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''پہلی بار دلی آئے ہو۔''

''تم کو کیسے پتہ۔''

''تمہارے چہرے سے، جس پر بارہ بج رہے ہیں۔''

''کہاں سے آئے ہو۔''

''سلطانپور کے پاس ایک گاؤں۔''

''پوربیا ہو بھیا، پھر تو خوب جمے گی اپنے، بچپن میں ہم وہاں ایک بار......''

وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ''کیا ہوگا اب بھگوان ہی رکھشا کرے۔''

مسلمان...... یعنی آتنک وادی...... خاص کر اس حلیے کے...... مولوی نما لوگ......

ٹی وی پر دیکھا تھا...... ماں باپ گاؤں...... سب کچھ بھول کر رات بھر اسے بم اور گولا بارود

ہی نظر آتا رہا۔ سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ رحمان اپنے بستر پر نہیں تھا۔ وہ تو چکرا ہی گیا۔ ٹین کا بکس بستر کے نیچے تھا...... پتہ نہیں کیا ہوا اس میں...... مگر اتنی صبح وہ کہاں جا سکتا ہے...... ہے بھگوان...... چلنے کی آواز قریب آئی تو وہ اپنے بستر پر آ گیا۔ دروازہ کھلا۔ دو پلی ٹوپی پہنے رحمان اندر آیا۔

''کا...... کہاں گئے تھے''

''تم ڈر گئے کا بھیا، ارے مرد آدمی بنو...... ڈر کا ہے کا، میں مسجد گیا تھا۔''

''مسجد...... اتنی سویرے...... کیوں......''

''نماز پڑھنے...... صبح صبح ہم لوگ فجر کی نماز پڑھتے ہیں۔''

اب اتنی سیرے نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ضرور کوئی پلان بنانے گیا ہوگا۔ پتہ نہیں اور کون کون سے اس کے ساتھی وہاں آئے ہوں گے۔ ہے رام...... اب کیا ہوگا۔ موت سامنے ہو تو ویسے بھی سارے راستے بند نظر آتے ہیں۔ گاؤں واپس لوٹ جاؤں......؟ تو ماں باپو کے ساتھ پورے گاؤں کو جواب دینا پڑے گا...... مت ماری گئی تھی ان کی...... جو بڑا آدمی بنانے کی لالچ میں اتنی دور بھیج دیا...... وہ بھی ایک آتنک وادی کے پاس...... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو......

اس نے تو مسلمان کو کبھی قریب سے دیکھا بھی نہیں تھا...... صبح صبح دیا رام کی دکان پر ریڈیو کی تیز آواز پر آنے جانے والے رُک جاتے...... روز روز نئی خبریں...... کشمیر کے آتنک وادیوں سے لے کر...... افغانستان تک کی خبریں...... آئے دن بم کے دھماکے...... پھر تو حد ہی ہو گئی تھی...... امریکہ جیسے دیش پر بم دھماکہ...... کشن چاچا تو ہول ہی گئے تھے...... رہنے کے قابل نہیں چھوڑا سالوں نے...... تھوکتے ہوئے انہوں نے کہا تھا...... پھر تو جیسے ہی کہیں پر بم دھماکے ہوتے ساری بھیڑ بول پڑتی ضرور مسلمانوں نے کیا ہوگا...... اور سچ مسلمانوں کا ہی کام ہوتا...... کتنے حملے ہوئے...... دیش ودیش ہر جگہ...... اور کرنے والے صرف مسلمان...... استرا چلاتے ہوئے دیا رام مسکرا کر کہتا ''لو کر دیا بھائی لوگوں نے کام۔ جی ہی نہیں بھرتا خون خرابے سے۔'' بچپن سے یہ جملے سنے تھے اس نے۔ چاچا نے

بتایا تھا کہ گاؤں میں رحیم کا کا اکلوتے مسلمان تھے۔ خود کو ڈاکٹر کہلواتے تھے۔ جھولے میں دوائیاں بھر کر مریض کی تلاش میں چاروں طرف پھرتے...... کسی کو بخار تو کسی کو دمہ...... ہر مرض کا علاج ان کے پاس تھا۔ کبھی صرف جھاڑ پھونک کر ہی مرض دور کر دیتے پھر ۶ ر دسمبر کے فساد کے بعد راتوں رات اپنا گھر اونے پونے بیچ کر کہاں گئے کسی کو پتہ نہیں چلا اور اب تو ڈرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی...... ریڈیو کی خبریں اس کے گاؤں سے بہت دور دور کی ہوتیں۔ مگر اب وہ...... ایک مسلمان کے ساتھ ایک کمرے میں رہے گا...... یہ آتنک وادی تو اس کا کریا کرم بھی اسی کمرے میں کر دے گا اور کسی کو خبر بھی نہیں لگے گی...... ہائے رام......

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''ارے تم ابھی تک سو رہے ہو، جانا نہیں ہے کیا؟''

اس کے چہرے سے چادر اٹھاتے ہوئے رحمان نے کہا۔

''ہیں...... کیا'' پتہ نہیں کون سا وقت تھا، اس کا پورا شریر بخار سے تپ رہا تھا۔

''تم کو تو تیز بخار ہے، گولی کھائی۔''

گولی...... کون سی گولی کی بات کر رہا ہے۔ ہڑ بڑا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر...... پھر لیٹ گیا۔

''ٹھہرو ہم کچھ کھانے کے لیے لاتے ہیں پھر گولی کھا لینا۔''

گولی...... گولی...... پتہ نہیں کیا مقصد ہے اس کا۔

''لو...... گرم گرم چائے پاؤ کھاؤ۔ تم نے تو شاید ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ شام ہونے والی ہے۔'' اٹھاتے ہوئے چائے کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''ہمیں تو ٹیوشن کے لیے جانا ہے۔ پہلے دن دیر ٹھیک نہیں ہے...... یہ کھا کر تم گولی کھا لینا۔''

تھیلے نما بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

چائے تو وہ ڈھابے سے لایا ہوگا۔ گرم بھی ہے، پاؤ بھی وہیں کا ہے۔ یہ کھانا ٹھیک ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا...... اور جلدی جلدی کھا گیا۔ گولی پتہ نہیں کیسی

ہے؟ اتنا بھروسہ ٹھیک نہیں۔ گلاس رکھ کر وہ لیٹ گیا۔

''ارے بھئی شہزادے اب تو اٹھ جاؤ۔ بخار تو ہے نہیں۔''

ماتھے پر ہاتھ رکھے وہ اسے اٹھا رہا تھا۔

''......کیا بجا ہے۔''

''صبح ہو گئی، کل تم بخار میں تپ رہے تھے اور گولی ویسے ہی رکھی تھی۔ میں نے اٹھا کر کھلائی تھی۔ یاد ہے۔''

گولی......کب کھائی میں نے......اور گولی کھا کر بھی میں ٹھیک ہوں۔ اس نے خود کو ہلا کر دیکھا۔

''یہ لو ناشتہ کر کے ایک گولی اور کھا لینا۔''

گولی......گولی......یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے گولی کے۔ کبھی یہ لوگ گولی کھلاتے ہیں تو کبھی مارتے ہیں۔ ہے رام......مجھے بہلا کر اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے تا کہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔ اس کے جاتے ہی وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ گولی ہاتھ میں رکھی رہی۔

اٹھا تو شام ہو رہی تھی۔ چھ بجے تھے پتہ نہیں وہ کہاں تھا۔ گولی بھی نہیں تھی۔ بخار تو نہیں تھا مگر بھوک سے حال بے حال تھا۔ ہمت کر کے وہ ڈھابے پر گیا۔ کلوا سے دیکھتے ہی مسکرایا۔

''کیسے ہو چندو بھیا......سنا ہے تمہیں بخار ہے۔ وہ تمہارے کمرے والے مولبی صاحب بتا رہے تھے۔ چائے اور پاؤ کے ساتھ تمہارے لیے دوا بھی لے گئے تھے......ارے ایسی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔'' اس نے چٹکی بجائی اور چائے کا گلاس بسکٹ کے ساتھ رکھا۔

اوہ تو دوائی کلو بھائی نے دی تھی۔ تب تو وہ ٹھیک ہے ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا......رحمان کے بارے میں کوئی بات کرنا اسے مناسب نہیں لگا اور وہ واپس آ گیا۔ کتاب اٹھائی مگر کمزوری کے سبب کل پر چھوڑ کر وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ دل میں وسوسے تھے تو نیند کس کو آنی تھی......یونہی منہ دیے پڑا رہا۔ ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا۔ چادر کی اوٹ سے اس نے دیکھا......وہی تھا۔ ہاتھوں میں وہی جھولا تھا پتہ نہیں کیا ہے۔ اس کا دل جاسوسی

پر آمادہ تھا۔ کہیں بم وم تو نہیں ہے۔ ایک خیال آیا اور اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے بکس کھولا۔ سامان اس میں رکھا اور اس کی طرف مڑا۔ ماتھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھا...... ''بخار نہیں ہے'' وہ خود ہی بڑبڑایا اور چادر اوڑھا دی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ماں باپو نے اسے اتنی دور بھیج دیا جہاں اس کا کوئی اپنا نہیں ہے...... جو ہے اس سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے مگر وہ تو دشمن سے بھی بدتر ہے...... اس کے لمس میں کتنی اپنائیت ہے...... مگر اس کے دل کا کیا پتہ...... اسے تو انسان کا خون ہی اچھا لگتا ہے...... مسلمان آتنک وادی...... اس پر بھروسہ کرنا بیوقوفی ہے...... پتہ نہیں ابھی بکس میں کیا رکھا، وہ اٹھا اور ہلا کر اسے دیکھا۔ وزن کا اندازہ تو نہیں کر سکا مگر کچھ بھاری لگا۔ پتہ نہیں کیا ہے...... اس کے پاؤں کی آہٹ پا کر وہ بستر میں گھس گیا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گے...... کبھی اس سے نفرت ہوتی تو کبھی اپنے پن کا احساس ہوتا...... مگر آتنک وادی تو ایسے ہی ہوتے ہوں گے...... پہلے اپنا ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور پھر...... چاچاجی کے گھر بھی ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ ٹی۔ وی پر ایک آتنک وادی کو بالکل اسی حلیہ میں دیکھا تھا...... سب نے اپنے طور پر ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی...... مگر ایک کمرے میں رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے...... کتاب ہاتھ میں پکڑے وہ خیالوں کے گھن چکر میں پھرتا رہا...... پڑھائی کا کیا فائدہ...... جب جیون کا ہی پتہ نہ ہو...... کیا معلوم بکس میں بم ہی ہو...... اور وہ کسی روز پھٹ ہی جائے......

''کہو استاد، ٹھیک ٹھاک۔'' وہ کمرے میں آیا۔ بت بنا وہ کتاب کھولے رہا...... اس نے بکس کھولا، تھیلے سے کچھ رکھا اور لیٹ گیا۔

''ہاں...... ہاں میں اسٹیشن وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ تم خیال رکھنا اور دعا کرنا۔''

سوتے سوتے اسے رحمان کی آواز آئی...... وہ فون پر کہہ رہا تھا، کس سے وہ سمجھ نہ سکا۔ تو اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ تھیلا ہاتھ میں لیے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی اس نے بکس کو اٹھایا۔ کافی ہلکا محسوس ہوا۔ تو وہ سب کچھ لے کر اسٹیشن گیا ہے۔ ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی...... کیا کرے پولس کو بتائے یا...... مگر تھانے تو وہ کبھی گیا ہی نہیں...... پھر پتہ نہیں کتنے لوگوں کی جان جائے گی...... کیا کرے...... کسی طرح سویرا

ہوا...... وہ باہر نکلا...... کلوا اپنے پیلے پیلے دانتوں کو ٹہل ٹہل کر مانج رہا تھا۔ وہ لپکا...... اور پھولی سانسوں کے درمیان ساری روداد سنائی۔ وہ بھی چکر کھا گیا۔

''تم کو یقین ہے نا...... وہ تھیلا بھر کر اسٹیشن ہی گیا ہے۔''

''بالکل...... ہم نے سب سنا اور۔''

''رگھو سے مشورہ لینا چاہیے...... وکالت پڑھ رہا ہے سب جانتا ہے۔''

رگھو ویر پرساد جب تک اپنی فائل لیے ڈھابے میں ناشتہ کرنے آتے بم دھماکے کی خبر ریڈیو نے صاف لفظوں میں سنادی تھی۔ آتنک وادی مسلمان ہے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا مگر وہ کون ہے اس کا پتہ صرف چندو کو تھا اور اب رگھو ویر اور کلو کو بھی ہو گیا۔

''اس کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا...... کچھ انعام کی بات سرکار کرے تو جا کر نام لے دیں گے۔''

رگھو ویر کا شاطرانہ دماغ کچھ زیادہ ہی تیز چل رہا تھا۔ وہ دونوں رقم برابر برابر بانٹنے کی بات کرنے لگے۔ چندو کا حال ہی برا تھا...... اگلی گاڑی سے وہ گاؤں چلا جائے گا جہاں کوئی مسلمان نہیں رہتا شانتی ہی شانتی ہے۔ ریڈیو پر برابر خبریں آ رہی تھیں...... پولیس کمشنر کا بیان آ رہا تھا، جانکاری دینے والے کو انعام میں ایک موٹی رقم دینے کا اعلان ہوا۔ تینوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور پولیس اسٹیشن کی جانب بڑھے۔ اصل سوال جواب چندو سے ہی ہونا تھا۔ رگھوا سے سمجھا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں جملے جوڑ رہا تھا۔ تینوں اندر داخل ہوئے...... سامنے بیٹھا پولیس افسر موجود لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کہہ دیا کہ مرنے والوں کی شناخت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ سرکاری رپورٹ آنے میں وقت لگتا ہے۔ تم لوگ خود اسپتال جا کر وہاں ڈھونڈو۔''

''مگر کہاں''؟ لرزتی ہوئی آواز جانی پہچانی لگی۔

تینوں مڑے۔

روتے بلکتے کئی لوگ کھڑے تھے...... اس میں ان کو رحمان بھی نظر آیا۔ ''تم''

تینوں چونکے وہ آنسو پوچھتا ان کی طرف لپکا۔

☆☆

ہار

صبا کو میں نے چوتھی بار فون لگایا اور اب بھی اس کا فون بند تھا۔ کیا کر رہی ہے وہ......؟ کہاں ہے؟ مانتی ہوں کہ اب وہ بچی نہیں ہے بلکہ خود ایک بچی کی ماں ہے...... اپنا بھلا برا خود سمجھتی ہے اور اپنے بارے میں ہر فیصلہ لینے کے لیے خود مختار بھی ہے...... بلکہ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ لینے کا حق تو اس نے اس وقت استعمال کیا تھا جب وہ محض بیس سال کی تھی۔ گریجویشن کر رہی تھی اور ہوسٹل سے فون کر کے بے حد اطمینان بھرے لہجے میں نے اس نے کہا تھا کہ وہ سہیل سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ کیا......؟ میں سن رہ گئی تھی اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے مجھے کرسی کا سہارا لینا پڑا۔ میری آواز میں موجود لڑکھڑاہٹ اور کپکپاہٹ محسوس کر کے اس نے بے حد عام لہجے میں کہا تھا۔

''مما میں شادی کر رہی ہوں، سب کرتے ہیں اس میں اتنا Over react کرنے کیا بات ہے۔''

''جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو، نا سمجھ ہو تم اور۔''

''یہ میری زندگی ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے مجھے۔''

''میں حق کی بات نہیں کر رہی ہوں بیٹا بلکہ تمہارے مستقبل کو لے کر فکر مند

ہوں۔ سہیل کون ہے کیسا ہے کیا......؟"

"مما آپ فکر نہ کریں۔ سہیل نے مجھے زندگی کے نئے معنی سمجھائے ہیں۔ میں بھوکی ہوں پیار کی بھی اور کھانے کی بھی۔ اس کے ساتھ مجھے یہ دونوں ہی ملے گا۔"

اور ـــ اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے چند بے حد واضح جملوں نے مجھ سے احتجاج کا حق بھی چھین لیا تھا۔ اس کے فیصلے سے مجھے دکھ پہنچے گا یہ وہ جانتی ہے۔ تو کیا اسی لیے وہ خوش تھی؟ میں نے پوری رات اور پورا دن صرف سوچتے ہوئے گزارا، مگر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ مجھے یقین تھا کہ صبا کا یہ فیصلہ صرف جذباتی ہے اور جذبات میں کیے گئے فیصلے کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتے...... مگر یہ صرف میں جانتی ہوں...... ایک سخت، مشکل اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے بعد ایک لمبے تجربے نے مجھے یہ سکھایا ہے۔ مگر صبا...... وہ تو ابھی بچی ہے...... اپنا بھلا برا ابھی نہیں سمجھ سکتی...... نادان ہے وہ...... پچھلے سال چھٹیوں میں جب وہ آئی تھی تو اس کے اندر ایک عجیب سی خاموشی اور خالی پن کو محسوس کیا تھا میں نے...... اس کی تنہائی کو کچھ حد تک بانٹنے کی کوشش کی تھی میں نے...... پھر مجھے ایک کانفرنس میں جانا پڑا۔ واپسی پر میں نے اسے فون کیا تو خلاف امید وہ خاصی خوش اور چہکتی ہوئی آواز میں مجھے تروتازہ کر گئی تھی۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا خریدا، اس کی تفصیل پوچھ رہی تھی۔ اور میرے اندر کا Guilt کم ہو گیا تھا۔ اب میں اسے زیادہ وقت دوں گی...... میں نے خود سے وعدہ کیا۔ جس وقت میں گھر پہنچی وہ موجود نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا پھر وہ کہاں گئی؟ میں پریشان ہو گئی۔

"وہ اسٹیشن گئی ہیں۔ سہیل صاحب کو چھوڑنے۔" سہیل صاحب کو چھوڑنے...... یہ کون ہے؟ بائی نے جس انداز سے یہ نام لیا تھا ایسا لگا کہ وہ اس نام سے خاصی مانوس ہے، مگر میں...... میں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا۔ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا۔ میں نے بائی سے اسٹرانگ سی کافی بنانے کو کہا۔

"یہ سہیل کون ہے۔" کافی دیر اس انتظار میں گزارنے کے بعد کہ وہ مجھے خود بتائے گی میں نے پوچھ ہی لیا۔ دوستی کا رشتہ تو کبھی تھا ہی نہیں ہمارا...... مگر اب ماں بیٹی کے

بیچ کسی تیسرے کی موجودگی نے ایک درار کو ضرور جنم دے دیا تھا اور اس وقت وہ درار کچھ زیادہ ہی واضح تھی۔ اس کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر سکا اور نا ہی اس نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ صرف یہ بتایا کہ انٹرنیٹ چیٹنگ (internet chatting) کے دوران وہ ملے تھے اور اب ایک اچھے دوست بن گئے۔ مگر میری غیر موجودگی میں اس کا آنا...... یہ محض اتفاق ہے۔ وہ اپنی آنٹی سے ملنے آیا تھا۔ وہ بھی یہیں تھی...... بس...... مگر میرے لیے اس ''بس'' کو یقین کر لینا مشکل تھا۔ اور میں نے اسے سمجھداری سے کام لینے کی صلاح دی۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔ میری بیٹی تھی وہ...... میں اسے ڈانٹ سکتی تھی...... سمجھا سکتی تھی۔ تھپڑ بھی مار سکتی تھی، مگر میں کچھ نہیں کر سکی۔ کمرے میں آئی اور سگریٹ سلگایا...... میں کب سے سگریٹ پی رہی ہوں...... میں نے یاد کرنا چاہا...... جانتی ہوں میں کہ سگریٹ پینے والی عورتوں کو سماج شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی عورتوں کو ''عورت'' کہتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا ہے...... کیوں؟ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔ میں سگریٹ پیتی ہوں تو صرف فرار حاصل کرنے کے لیے...... اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک چکی ہوں شاید...... اس لیے...... مگر میں کس سے لڑ رہی ہوں۔ میں اقتصادی طور پر خود مختار ہوں...... رشتوں کی زنجیر سے خود کو آزاد کر چکی ہوں...... سگریٹ نوشی میرے لئے بغاوت نہیں بلکہ میری عادت ہے...... جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو سگریٹ کا دھواں میرے اردگرد ایک ہالہ بنا دیتا ہے جس کے بیچ میں خود کو بے حد پرسکون اور محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ مگر آج یہ سگریٹ بھی مجھے پرسکون رکھنے میں ناکام ہے۔ میں نے زندگی میں غلطیاں کی ہیں اور ان غلطیوں کو جھیلا بھی ہے مگر اب میری بیٹی اسے دہرائے یہ مجھے منظور نہیں۔ صبا کو سہیل نیٹ پر ملا تھا اور دونوں اچھے دوست بن گئے۔ صبا نے بے حد نارمل لہجے میں مجھے بتایا تھا۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا...... مگر شادی۔

''مما میں نے اپنی زندگی اکیلے گزاری ہے، وقت نے مجھے بہت Mature کر دیا ہے۔''

میں خاموش ہوگئی۔ کیا جتانا چاہتی ہے وہ...... اپنی کون سی محرومی بتا کر مجھے

احساس جرم میں مبتلا کر رہی ہے۔ میرا یہ کیریر یا پھر یہ شہرت اور عزت...... جو مجھے بے حد جدوجہد کے بعد ملا ہے۔ صبا چھ مہینے کی تھی جب میری اس کے پپا سے علیحدگی ہوئی تھی۔ ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ کون صحیح تھا اور کون غلط...... تجزیہ کرنے کا وقت نا تب تھا اور نا اب۔ ''بچے نوکروں کے ساتھ نہیں پلتے۔'' آصف کا خیال تھا اور مجھے لگا کہ یہ وہ نہیں بلکہ اس کا احساس کمتری ہے۔ ایک بات جب بحث بن جائے اور لڑائی کی صورت اختیار کرنے لگے تو کیا کیا جائے؟ اسے چھوڑ کر ایک نئی شروعات؟ یہ میرا خیال تھا اور میں نے آصف سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ تکلیف بھی ہوئی اور درد بھی...... تنہائی ستانے لگی تو میں نے صبا کو اپنا محور بنالیا اور زندگی کے خالی پن کو پُر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وقت کا اپنا کھیل ہوتا ہے۔ ایک کانفرنس کے دوران میری ملاقات اطہر سے ہوئی اور تین دن کی اس ملاقات میں اس نے مجھے میرے اندر چھپی صلاحیتوں کو باہر لانے پر اکسایا۔ اپنے وجود کو پہچاننے کی صلاح دی۔

''بچے تو پل ہی جاتے ہیں، بڑے ہو کر وہ اپنی ماں کی کامیابیوں پر فخر محسوس کرے گی۔''

اطہر کی بات میرے دل میں اتری۔ مجھے زندگی کے نئے معنی مل گئے۔ واقعی ہر رشتے کی اپنی جگہ اور اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے بھی بچے کی نہیں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ صبا کے ساتھ کھیلتے ہوئے مجھے ان کے فون کا انتظار رہنے لگا اور گھنٹی کی آواز مجھے ویسے ہی خوش کر جاتی جیسے صبا کسی نئے کھلونے کو دیکھ کر ہوتی۔ صبا کی دیکھ بھال کے لیے ایک Full Time ملازمہ آ گئی۔ اطہر نے اپنے نئے پروجیکٹ میں مجھ کو شامل کرلیا۔ میرے مضامین جرنلس میں آنے لگے...... مختلف سمینار اور کانفرنس کے دعوت نامے میری میز پر سجنے لگے۔ میں عورت تھی۔ وہ بھی ایسی جس کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا...... کیوں......؟ یہ جاننے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔ میری پیٹھ پیچھے کہانیاں بنائی جاتیں...... میں بھی سنتی...... پہلے عجیب لگا۔ پھر عادت پڑ گئی اور جب نظر انداز کرنا مشکل ہوگیا تو ہم ایک ہوگئے۔ حالانکہ اطہر شادی شدہ تھے مگر ان کی بیوی ساتھ نہیں تھی...... ان کا جواب بھی تسلی

بخش نہیں تھا مگر میرے لیے چوز کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اطہر کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اکثر آصف کا خیال آجاتا...... جہاں صرف گھٹن تھی اور قید...... صحیح اور غلط کی بحث...... اور یہاں آزادی تھی...... راستے تھے...... اڑان تھی...... اور میں پرواز کے لیے تیار تھی۔ پہلی بار جب میں ملک سے باہر کانفرنس میں شامل ہونے گئی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ پھر میں اکثر باہر جانے لگی...... ایسی ہی ایک ٹرپ سے لوٹنے پر میری ملازمہ نے اطہر کے کردار کا خلاصہ کیا تو میں حیران رہ گئی...... اور آگے کی طرف بڑھتے میرے قدم لڑکھڑا گئے...... میں کیا کروں...... صبا کو میں نے ہوسٹل بھیج دیا اور اس سے پہلے کہ میں اطہر سے کوئی بات کرتی، انہوں نے ملک سے باہر جانے کا فرمان مجھے سنا دیا۔ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ چلے گئے اور میں اپنی تنہائی بند کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کے بیچ گزارنے لگی۔ صبا کی کمی مجھے کھلتی۔ مگر اس کے اچھے مستقبل کی خاطر میں نے ممتا کے سوتے اپنے اندر ہی بجھا دیے اور اس کا کورس مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی...... پھر اچانک سہیل کا اس کی زندگی میں آنا اور اب اس سے شادی کا فیصلہ...... میرا بے چین ہونا فطری تھا مگر اس کی خواہش اور اس سے زیادہ اس کی ضد کے آگے میں مجبور تھی۔ سہیل ایک بینک میں ملازم تھا۔ نو سے پانچ کی نوکری اور پھر گھر...... اس کا مستقبل ایک محفوظ ہاتھوں میں تھا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

پہلی بار صبا کے گھر جاتے ہوئے دل میں وسوسے تھے۔ مگر وہاں پہنچ کر سب دور ہو گئے۔ بنی سنوری اور حیران کر دینے کی حد تک سعادت مند بیوی کا یہ روپ صبا نے کہاں سے اختیار کیا تھا، میں سمجھ نہیں سکی۔ سہیل کے کھانے، کپڑے پسند اور ناپسند کی لمبی فہرست اس کے ہونٹوں پر تھی۔ وہ خاصی ذہین تھی۔ اسکول اور کالج کے اس کے ریکارڈس بہترین تھے۔ بہت کچھ کرنے کی صلاحیت تھی اس کے اندر۔ مگر آج گھر کی چہار دیواری میں قید شوہر کی ٹائی اور رومال کا حساب رکھنے میں اپنی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے کیا وہ واقعی خوش ہے...... یا خوش رہنے کا دکھاوا کر رہی ہے۔ میرے اندر کی عورت نے مجھے جاننے کے لیے اکسایا۔ مگر ایک ماں نے اسے خاموش کر دیا۔ یہ صرف میرا وہم ہے۔ میری بیٹی خوش ہے۔

ہنستے کھلکھلاتے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہے۔ رشتے شاید ایسے ہی پنپتے ہیں...... اپنی قربانی دے کر...... میں کبھی رشتوں سے انصاف نہیں کرسکی۔ مگر میری بیٹی...... دل میں آئے خدشات کو نکار کر میں مطمئن ہو کر وہاں سے لوٹی۔ اگلے سال وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ وقت کافی آگے نکل چکا تھا۔ مجھے صبا کی پیدائش یاد آئی۔ ماں بننے کے عمل سے میں گزری ضرور تھی مگر کبھی ماں نہیں بن سکی۔ مگر صبا...... ممتا کا ہر پل جیے گی۔ چھوٹی سی ثمرہ کو گود میں لے کر میں نے سوچا تھا، ماں بن کر شاید وہ میری ممتا کو سمجھنے لگی تھی۔ اب اکثر وہ خود فون کر کے مجھے ثمرہ کے پل پل کی خبر دیتی...... مگر پھر اس کے لہجے میں مجھے ایک الجھاؤ محسوس ہوا کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی بے چینی تھی اس کے اندر...... کیا؟ میں گھبرا کر اسے فون کرتی۔ سہیل کے بارے میں دریافت کرتی مگر وہ ٹال جاتی۔ کبھی اس کا فون بند ہوتا اور کبھی گھنٹی کے باوجود وہ اٹھاتی نہیں تھی۔ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا؟ بہت دیر بعد اس نے فون اٹھایا۔

''میں دوا کھا کر سو رہی تھی؟''

''مگر کیوں؟ کیا ہوا ہے تمہیں'' بغیر کسی جواب کے اس نے فون رکھ دیا۔ کئی دنوں تک کریدنے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ ''سہیل سے علیحدہ ہو رہی ہے۔''

''کیا؟''

یہ دھماکہ تھا میرے لیے۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ وہ اب بھی اتنی ہی نادان ہے جتنی دو سال پہلے تھی۔ اسے اب پھر اندازہ نہیں ہے کہ وہ کون سی غلطی کرنے جارہی ہے۔ مجھے لگا کہ میں خود اسی ٹوٹ پھوٹ سے دوبارہ گزرنے والی ہوں...... نہیں...... میں اسے روک لوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

''مگر کیوں......؟''

''مما گھٹن ہوتی ہے مجھے اس ماحول میں یہ زندگی جیتے ہوئے۔ میں پڑھائی پوری کروں گی اور پھر نوکری۔''

اس کے لہجے میں بسی پختگی مجھے حیران کرگئی۔ مگر اتنی جلدی میں ہار ماننے والی نہیں تھی۔

''شادی کے اندر رہتے ہوئے بھی تم یہ سب کر سکتی ہو۔''

''بالکل نہیں...... میں Psychic ہو جاؤں گی...... یا پھر ان عورتوں کی طرح جو ہر وقت وظیفے پڑھ کر خود پر اور چاروں طرف دم کرتی رہتی ہیں۔''

صبا نے مجھے خاموش کر دیا تھا۔ ثمرہ سو چکی تھی۔ وہ جاگ رہی ہے مجھے معلوم تھا۔ مگر ایک بستر پر لیٹے ہوئے ہم ایک دوسرے سے میلوں دور تھے۔ کتنی تنہا ہے وہ اس وقت...... میں جانتی ہوں۔ مگر صبا سمجھ نہیں رہی ہے۔ شادی کی حفاظت گاہ سے باہر قدم رکھتے ہی وہ کتنی اکیلی اور بے بس ہو جائے گی۔ وہ نہیں جانتی۔ صبح کی چائے پیتے ہوئے میں نے ایک آخری کوشش کی۔

''آپ نے بھی تو پپا کو چھوڑ دیا تھا۔'' یہ عدالت نہیں تھی مگر اس کا لہجہ وکیلوں جیسا تھا۔

''میں مجبور تھی میرے پاس صرف یہی ایک راستہ تھا۔'' مجھے صفائی دینی تھی۔

''میں بھی مجبور ہوں۔''

''مگر تمہاری بچی...... وہ۔''

''یہ میری ذمہ داری ہے اور میری ساتھی بھی۔ میں اسے کبھی خود سے الگ نہیں کروں گی۔'' اب کیا جتانا چاہتی ہے صبا...... میں ہکا بکا رہ گئی...... اس کو غلط ٹھہرا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔

''میں نے تمہیں کبھی نہیں چھوڑا تھا...... الگ ہوئی تھی تمہارے پپا سے بس...... کیونکہ ہماری سوچ، ہمارے خیال، ہماری راہیں اور ہمارا مقصد سب الگ تھا۔''

''نیا گھر بسانے کی کوشش بھی تو کی تھی آپ نے۔'' بیٹی کے سامنے اپنا دفاع کرتے ہوئے کتنی بونی لگ رہی تھی میں...... کاش کہ مجھے موت آ جاتی...... شدتِ جذبات سے کانپتے ہوئے میں بہ مشکل بولی۔

''وہ بھی ضرورت کے تحت...... اکیلے زندگی گزارنا۔''

''مگر میں کسی مرد کے لیے اپنی بیٹی کو خود سے الگ نہیں کروں گی کبھی نہیں۔''

صبا کا یہ وار کسی تھپڑ سے کم نہیں تھا۔ میری نظریں جھک گئیں۔ کیا میں واقعی ہار

گئی۔ دنیا کی نظروں میں مَیں ایک کامیاب عورت سہی، مگر اس وقت کسی ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح جھول رہی تھی۔ بہت سی ملی جلی آوازیں کسی چیخ کی شکل میں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ''جیسی ماں ویسی بیٹی...... جیسی ماں ویسی بیٹی'' کاش صبا اس کو غلط ٹھہرانے کے لیے اتنا بڑا اقدم نہ اٹھائے...... مگر شاید یہ بھی سچ ہے کہ صبا کے لیے اس کا وجود کبھی کسی اہمیت کا حامل نہیں رہا وہ اسے ایک بے کار شے سمجھتی ہے۔ ایک ایسی ہستی جس نے نہ تو اسے ایک محفوظ اور خوشگوار بچپن دیا اور نہ ہی مستقبل کی کوئی امید...... وہ ایک ہاری ہوئی ماں ہے...... ایک ایسی ماں جو اپنی شرطوں پر زندگی گزارنے کے باوجود اپنی بیٹی سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ:

''دیکھو میں بھی ایک گھٹن بھرے بندھن کو توڑ کر ایک خوشگوار اور مطمئن زندگی گزار رہی ہوں تم بھی ضرور خوش رہو گی۔''

مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو اس کے ساتھ ہوا وہ صبا کے ساتھ نہ ہو۔ اور اگر ہوا تو...... تو پھر کیا ایک ماں اپنی بیٹی کے سامنے بے بس اور لاچار کھڑی اس کے تیکھے سوالوں کو برداشت کر پائے گی؟ کیا صبا کو اس نے اتنا مضبوط اور طاقتور بنایا ہے؟ کہ وہ ثمرہ کے سوالوں کا جواب دے سکے...... یا ایک بار پھر وہ ہار جائے گی۔ وہ نہیں شاید ایک ماں۔

☆☆

کسک

نیویارک سے دلی کا ہوائی سفر میرے لئے طویل تر ہوتا جارہا تھا اور میں بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ آس پاس بیٹھے لوگ بھی شاید میری بے چینی ضرور محسوس کر رہے ہوں گے۔ یہی سوچ کر خود کو نارمل رکھنے کی کوشش میں مَیں برابر بیٹھی جولیا سے باتیں کر کے اپنے آپ کو ہلکا کر رہی تھی۔

''آپ کچھ پریشان ہیں کیا بات ہے۔'' ایرہوسٹس سے جب میں نے تیسری مرتبہ دلی پہنچنے میں رہ گئے وقت کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ٹوکا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' میں زبردستی مسکرائی۔ مگر اس خیال سے کی کہیں ہم دونوں میں باتوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تو فلائٹ کا یہ وقت کیسے گزرے گا۔ میں بولی۔

''میں اپنے والدین کے گھر جارہی ہوں پورے تیس سال بعد۔''

''تیس سال بعد کیا وہ ہیں۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نہیں'' میں جذباتی ہوگئی۔ ''میری بدنصیبی ہے کہ وہ نہیں رہے مگر میرا گھر، بھائی، بہن۔''

''تو کیا سب ویسا ہی ہوگا۔ Quite amazing'' اپنی نیلی بڑی بڑی آنکھیں

نکال کر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں ہر چیز...... میری آنکھوں کے پردے پر ہر تصویر نقش ہے۔ میرے دل پر ایک ایک یاد ویسے ہی تازہ ہے۔ انہیں یادوں کے سہارے تو میں اب تک زندہ ہوں۔'' میری آنکھیں خواہ مخواہ گیلی ہو گئیں۔

''ہم لوگ کسی چیز سے اتنا لگاؤ پیدا ہی نہیں کرتے کہ ان کے کھونے کا غم کریں۔ یہ جو جذبات ہوتے ہیں نا وہ صرف دکھ ہی دیتے ہیں یا پھر زندگی میں ایک طرح کا Stagnation create کر دیتے ہیں جبکہ زندگی میں movement بہت ضروری ہوتا ہے۔ مجھے دیکھو میں امریکی ہوں میری ممی Irish ہیں اور پاپا پنجابی جو اب آسٹریلیہ میں ہیں اپنی نئی فیملی کے ساتھ۔ پاپا سے طلاق کے بعد ممی نے ایک Canadian سے شادی کر لی مگر کچھ دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئیں اور اب ایک جرمن سے شادی کے بعد جرمنی چلی گئیں۔ میری امریکن کمپنی ہندوستان میں ایک برانچ کھول رہی ہے مجھے آفر ملی تو میں فوراً تیار ہو گئی۔ پاپا سے بہت پہلے ملی تھی وہ مجھے بہت اچھے لگے۔ فی الحال ان سے ملنا ممکن نہیں اس لئے میں ان کے وطن جا کر انہیں محسوس کر لوں گی۔

جولیا کی باتیں میں بے دلی سے سن رہی تھی۔ چار سال سے میں نیویارک میں رہائش پذیر تھی مگر وہاں کے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی اس لئے اس کی باتیں میرے احساسات سے بالکل الگ تھیں اور میں نے سیٹ سے گردن ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ میرا دماغ جہاز سے کئی گنا تیز پیچھے کا سفر طے کرنے لگا۔ اپنے گھر کا ایک ایک منظر چھوٹی سے چھوٹی بات تک میرے ذہن کے دریچے سے جھانک رہی تھی)۔ اپنا گھر کتنا اچھا تصور ہوتا ہے۔ کتنا دلفریب اور مسرور کن...... جہاں بچپن گزرا...... انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ گری اور گر کر سنبھلنا سیکھا۔ بجنا سنورنا، آئینے کے سامنے خود کو نہارنا...... اٹھلانا اور پھر خود ہی شرما جانا بہن بھائی سے لڑنا جھگڑنا...... بے شمار لمحات...... کھٹے میٹھے تجربات کا انگنت انبار...... شادی کر کے جب میں وہاں سے رخصت ہوئی تھی تو محض اٹھارہ سال کی تھی اور اب اتنے عرصے بعد دوبارہ اس گھر میں قدم رکھنا کتنا جذباتی مرحلہ ہوگا۔ جہاں کی ایک ایک

چیز سے اپنائیت کی خوشبو آتی تھی...... ان سب کو دوبارہ دیکھنا...... چھونا اور محسوس کرنا...... کتنا مسرت بخش لمحہ ہوگا۔ میں nostalgic ہونے لگی۔ حالانکہ اس بیچ اپنے گھر میں کافی تبدیلیاں ہوئیں جن کی خبر مجھے اماں، جوہی اور رانی کے تفصیلی خطوں سے ملتی رہتی۔ ہر تبدیلی کو میں نے بار بار سوچا اور محسوس کیا تھا۔ سب سے بڑا شاک مجھے دادی کے انتقال کی خبر سن کر لگا۔ اس وقت باڈر کے تعلقات بہت خراب تھے اور آنے کا سوال ہی نہیں تھا اور افضل کے سمجھانے پر میں نے کچھ حد تک ایسی بہت سی خبروں کے لئے خود کو تیار کرلیا تھا۔

اور پھر اماں کے مختصر سے خط سے مجھے گھر کے بٹوارے کی خبر ملی۔ پورا دن خط پڑھ کر میں بٹوارہ کی وجہ تلاش کرتی رہی تھی۔ بٹوارا چاہے ملک کا ہو یا گھر کا یا پھر دلوں کا ہو، ہر جگہ اپنے پیچھے انگنت آنسو، آہیں، تڑپ اور نفرت کا نا بجھنے والا ناسور چھوڑ جاتا ہے اور ایسی ہی کیفیت سے میں دوچار تھی۔ جس کا اندازہ افضل نے لگالیا۔ آفس سے آتے ہی وہ چائے پینے کے عادی تھے۔ حسب عادت میں کچن میں آئی وہ پتہ نہیں کب میرے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ چونکی تو میں اس وقت جب کپ میں شکر ڈالنے کے بجائے نمک کا ڈبہ اٹھالیا اور کپ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کوئی پریشانی ہے۔''

''نہیں نہیں۔'' میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولی مگر چائے پیتے ہوئے خط میں لکھی ساری تفصیل میں نے انہیں بتاڈالی۔

''ارے بھئی یہ تو زندگی کا کاروبار ہے۔ ہر گھر میں یہ ہوتا ہے تم بلاوجہ پریشان ہورہی ہو۔'' اتنی سرلیس بات انہوں نے سرسری انداز میں کہہ دی اور میں کھڑکی پر سر ٹکائے کتنی دیر خود ہی وجہ تلاش کرتی رہی۔ مگر پھر اس بوگن ویلیا کا کیا ہوا ہوگا۔ جو میں نے اور چچا کی بیٹی جوہی نے مل کر آنگن کے بیچوں بیچ لگایا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی شاخیں دونوں طرف برابر برابر بانٹ لی گئی ہوں...... ضرور یہی ہوا ہوگا اور پھر انہیں شاخوں کے پیچھے سے مجھے دادی کا پرنور چہرہ ابھرتے ہوئے نظر آیا جو ہمارے گھر کے لیے ایک ستون کی طرح تھیں۔ کتنا روئی تھی میں ان کے انتقال کی خبر پاکر...... مگر چاہ کر بھی جا نہیں سکی تھی۔ دادی کی مرضی

اور اصرار پر میں اتنی دور بیاہ کر آئی تھی کہ وہاں ہونے والی خوشی اور غم میں میرا کوئی حصہ نہیں رہ گیا تھا۔ میری سسرال والے دادی کے دور کے رشتہ دار تھے جو بٹوارے کے بعد پاکستان آگئے اور پھر مجھے بھی لے آئے۔ کتنی معصوم تھی میں ان دنوں...... کبھی کبھی جب گھر کی یاد شدت سے آتی تو مجھے دادی پر بہت غصہ آتا تھا جنہوں نے مجھے سب سے اتنی دور کر دیا تھا۔ مگر پھر اپنے گھر کا سکون و آرام دیکھ کر مجھے بے اختیار دادی کی محبت اور شفقت یاد آجاتی جنہوں نے مجھے اپنوں سے تو دور کر دیا تھا مگر خوشیوں کا ہار میرے ارد گرد ڈال دیا تھا۔

لیکن...... اماں کی اچانک موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے صبر کا ہر باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ کتنا روئی تھی میں۔ مگر ان دنوں دونوں ملکوں کے حالات نے ایک بار پھر مجھے روک دیا تھا۔ اس دن زور سے بادل گرجے تھے۔ طوفانی بارش ہوئی تھی اور اس بارش میں میرے تمام آنسو بہہ گئے تھے۔ واپس بھارت لوٹنے کا خیال ہی میں نے دل سے نکال دیا۔ یکے بعد دیگرے بہت سی تبدیلیاں دونوں طرف ہوئیں۔ پرانے لوگ ایک ایک کر کے ختم ہوتے رہے اور نئے نئے رشتے آپس میں جڑ گئے۔ بھائیوں کی شادی ہوگئی۔ جوہی اور حنا اپنی اپنی گرہستی میں مصروف ہوگئیں۔ باڈر کھلا دونوں طرف آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا مگر ایک میں ہی تھی جسے ہر بار کسی نہ کسی ناگزیدہ حالات کی بنا پر رکنا پڑا۔ ایک بار پروگرام فائنل ہوا تو میری ساس کو فالج ہوگیا۔ کئی مہینے ان کا علاج ہوتا رہا۔ پھر پلان بنا تو چھوٹے لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اسپتال کی بھاگ دوڑ کے دوران میں بھول ہی گئی کہ مجھے انڈیا جانا تھا۔ اور کئی سال سرک گئے...... میرا بڑا بیٹا امریکہ منتقل ہوا تو ہم سب کو بھی اس نے زبردستی بلا لیا۔ بیٹی کی شادی ہوگئی چھوٹے بیٹے کو نوکری مل گئی تو زندگی میں ٹھہراؤ آیا اور ایک دن افضل نے انڈیا کا ٹکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے react کیا جائے۔ پھر سنبھلی تو جانے کی تیاری شروع ہوگئی۔ یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ مجھے گھیرے ہوئے تھا کہ ایر ہوسٹس نے دلی پہنچنے کا اعلان کیا...... دل میں عجیب سی کھلبلی ہوئی۔ اور ایر پورٹ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے میں باہر آگئی۔ آنسو پوچھتے ہوئے میں نے رسیو کرنے والوں کی بھیڑ میں راشد کو پہچانا۔ جتنا بڑا میں اسے چھوڑ کر گئی تھی

اس سے کہیں بڑا اس کے ساتھ کھڑا اس کا بیٹا احمد تھا۔ پورے راستے ہم ادھر ادھر کی بات کرتے رہے۔ ایک سلسلہ شروع ہوتا تو دوسرا کہیں اور سے جڑ جاتا۔ اس خوشی کے موقع پر بھی میں بے اختیار ہنس دیتی تو کسی بات پر پلکیں خود بہ خود بھیگ جاتیں۔ مگر باتیں تھیں کہ جیسے نکلتی آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ کسی بات پر راشد نے کہا تھا۔

''ارے آپا تم بھی کہاں کہاں کی بات یاد کئے بیٹھی ہو۔ اب تو سب کچھ بدل گیا۔ اتنا لمبا عرصہ بیت گیا۔''

میری سوچ کو جیسے بریک لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میرا ذہن دلی کی بدلی ہوئی تصویر پر ٹک گیا۔ میرے لئے کچھ بھی پہچاننا ناممکن تھا۔ چاروں طرف ٹریفک کا زبردست شور...... چوڑی سڑکیں...... فلائی اوور (flyover)...... اونچی اونچی عمارتیں...... بھاگتی ہوئی زندگی...... اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی پرانی دلی کی تنگ مگر کچھ کچھ جانے پہنچانے علاقے میں داخل ہوئی تو میری خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں رہا اور میں چیخی۔

''ارے یہ تو راموں کاکا کا گھر تھا۔ جہاں ہم دوپہر کو جامن توڑنے جاتے تھے اور تم کو یاد ہے راشد انہیں کے گھر سے تم نے گلاب کا پودا اکھاڑا تھا اور وہ دوڑاتے ہوئے گھر تک آ گئے تھے اور پھر چچا نے ان کے سامنے تم کو تھپڑ مارا تھا۔'' میرے سامنے وہ سین ویسے ہی چل رہا تھا اور میں نے خوش ہو کر سنایا۔ احمد میری بات سن کر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ ڈرائیور بھی مسکرا رہا تھا مگر راشد کے چہرے پر عجیب سی خفگی تھی جسے میں نے محسوس کر لیا۔

''اپیا تم بھی...... کیا کیا یاد کر کے رکھے ہوئے ہو۔'' وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔ اور میں اس سے کہنا چاہ رہی تھی۔ یادیں نہیں راشد...... یہی سب تو میرا کل سرمایہ ہے جسے میں اپنے ساتھ لے کر گئی تھی۔ اور برسوں سے ان کو سہیجتے ہوئے چلی آ رہی ہوں۔ ان کا عکس میری آنکھوں میں محفوظ ہے اور تیس سال پہلے کا ہر واقعہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے سہارے میں زندہ ہوں۔ وہ سب میرے بچپن کا ایک حصہ ہیں میرے اپنے ہیں اور آج بھی میرے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ ہیں۔ بقیہ راستے میں خاموش ہی رہی۔ مگر میرا دماغ ماضی کے ایک ایک ذرہ سے گرد صاف کر رہا تھا۔ اس موڑ پر رحیم چچا کا گھر

ہے...... جہاں میں نے قرآن شریف پڑھا تھا۔ان کے برابر ادریس بھائی کا گھر ہے......
جہاں ایک نیم کا بڑا سا درخت تھا اور وہاں ہمیشہ ایک جھولا پڑا رہتا تھا۔ان کی بہن شکیلہ میری پکی سہیلی تھی۔پتہ نہیں کتنی بار ہم نے گڑیوں کا بیاہ رچایا تھا۔ان کے گھر کے پیچھے ایک چورن کی دکان تھی۔چورن والا پڑوسی ہونے کے ناطے ہم دونوں کی ہتھیلی پر ایک ایک چمچ چورن رکھ دیتا تھا اور ہم دونوں چٹخارے لیتے ہوئے جھولا جھولتے رہتے......اور یہ گھر مہندی والی ممانی کا ہے...... مجھے سوچ کر ہنسی آ گئی۔ہم سب سہیلیاں مل کر ان کی مہندی کی باڑھ پر دھاوا بول دیتے تھے۔کچھ دیر تو سب لوگ خاموشی سے پتیاں توڑ کر اپنے دوپٹوں میں بھرتے رہتے پھر کسی کی مہندی گر جاتی اور وہ چلاتی...... اس سے پہلے کی کوئی اس کی مدد کو آتا ممانی اپنا ڈنڈا کھڑ کھڑاتیں اور ہم سب ان کو کوستے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے...... ہر گھر ہر انسان سے جڑی کوئی نہ کوئی کہانی تھی......کوئی اچھا تھا کوئی برا تھا...... کسی کی کچھ خوبی تھی کسی کی کوئی خامی...... مگر وہ سب میرے اپنے تھے اس لئے مجھے یاد تھے۔

اور پھر ہمارا گھر آ گیا...... گاڑی رک گئی...... میں اتری...... نئے نئے بہت سے چہرے میرے سامنے تھے۔ان میں سے ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا اور میں بھی انجان بنی سب کے بیچ کھڑی تھی۔کوئی مجھے گلے لگا رہا تھا کوئی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا تو کوئی دوڑ دوڑ کر چائے کا سامان میز پر لگا رہا تھا۔میں خوشی کا اظہار کروں یا غم کا...... تیس سال پہلے کا جو...... تصور میری آنکھوں میں بسا تھا اس کی کوئی نشانی نہیں تھی۔میری یادداشت مجھے دھوکہ دے رہی تھی۔یا پھر میری آنکھیں مجھے چھلاوا دے رہی تھیں۔جو کچھ دیکھنے کی کشش لئے میں یہاں آئی تھی...... وہ جو میرا اپنا تھا ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔پل بھر میں مجھے عجیب سی اجنبیت کا احساس ہوا اور میں چائے کا کپ لئے نئے طرز کے بنے باورچی خانے میں داخل ہوئی۔سامنے نظر پڑتے ہی جیسے مجھے سارے جہاں کی دولت مل گئی ہو۔نفیسن بوا اپنی مخصوص پیالی میں چائے لئے اس میں روٹی مسل رہی تھیں۔''نفیسن بوا......'' اور میں بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔وہ شاید سن نہیں سکتی تھیں۔آنکھوں کی روشنی بھی بہت کم لگ رہی تھی۔زندگی کے آخری پڑاؤ پر تھیں۔مگر میرے لئے اس وقت وہ سب کچھ

تھیں۔میرا تیس سال پرانا دردان کی کمزور بانہوں میں کم ہور ہا تھا۔میرا بچپن ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ان سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا مگر میں نے ان کو ہمیشہ اس گھر میں دیکھا تھا وہ بھی مجھے چھو کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ان کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ مجھے پہچان چکی ہیں۔ہم دونوں ہی بے اختیار رو رہے تھے۔یہاں تک کہ زبان بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئی۔اور تبھی لائٹ چلی گئی۔ ماچس...... موم بتی......ملی جلی کئی آوازیں آئیں۔سامنے ہی اماں کا کمرہ تھا جہاں الماری کے دائیں طرف اوپر کے کونے میں ہمیشہ دونوں چیزیں رہتی تھیں۔ میں نے اپنی عمر کا لمبا حصہ لمحوں میں طے کرلیا اور اس دور کی ایک الھڑ اور نٹ کھٹ لڑکی کی طرح دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور کونے میں ہاتھ رکھ دیا۔تڑاخ سے کوئی چیز گری اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔میں شرمندہ ہوگئی۔

''ارے یہ میرے کمرے میں کس نے کیا گرادیا۔'' میری چھوٹی بھاوج کی آواز آئی اور تبھی لائٹ بھی آگئی۔اماں کے کمرے کا نام ونشان بھی کہیں نہیں تھا۔الماری کی جگہ خوبصورت شوکیس میں مختلف چیزیں سجی ہوتی تھیں۔آنکھوں میں آنسو لئے میں آنگن میں آگئی۔سامنے لگی بوگن ویلیا کی بیل کا کہیں پتہ بھی نہیں تھا اور اس کی جگہ گلاب کے خوبصورت پھول مسکرار ہے تھے اور میں انہیں دیکھ کر کبھی ہنس رہی تھی اور کبھی رو رہی تھی۔

☆☆

سانپ

گلی میں شور تھا زبان کے ساتھ ساتھ کنکر پتھر بھی برس رہے تھے۔ کون کیا کہہ رہا ہے سمجھ میں آنا مشکل تھا۔ منگلو شاید گروپ لیڈر تھے کیونکہ سب سے آگے وہی تھے۔ ناک بہہ رہی تھی...... بال بگڑے...... لال لال پھولے گال...... ہونٹوں سے پانی جیسا مادہ بہہ کر ٹھوڑی تک آ چکا تھا...... اور اس پر شعلہ اگلتی آنکھیں...... مسلی ہوئی قمیص کا آدھا بٹن غائب...... نیکر جس کے اصل رنگ کا اندازہ کرنا مشکل تھا پیروں پر شاید کھروچ تھی...... اس لئے جگہ جگہ خون بھی جمع تھا...... اس کے باوجود غضب کے تیور...... تخلیقی ذہن رکھنے والا کوئی بھی دس سال کے منگلو کو آنے والے وقت کا Angry young man کا خطاب دے سکتا تھا۔ ایک بڑی سی اینٹ ہاتھ میں لئے وہ سامنے والے پر پھینکنے ہی والے تھے کہ چیختی چلاتی ان کی ماں موسی کے ساتھ آ گئی۔ ماں کو دیکھتے ہی آنکھ رگڑتے منگلو اس کے سینے سے لپٹ گئے باقی لڑکے غائب ہو گئے۔

''ارے کم بختو...... کرم جلو...... ابھی بتاتی ہوں۔'' موسی نے سب کو للکارا مگر میدان خالی دیکھ کر آگے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

''کیوں بلاوجہ لڑتا ہے۔ سب نے کتنا مارا۔'' نل کے نیچے بٹھا کر صابن رگڑتے

ہوئے ماں نے لاڈ سے کہا۔

''میں نے بھی مارا'' اور ہاتھ سے ایکشن کر کے بتانے لگے۔ ماں جھک کر پیٹھ میں صابن لگانے ہی والی تھی کہ منگلو کا گھومتا ہاتھ اس کے سر پر لگا۔ ماں نے آؤ دیکھا نا تاؤ، جم کر دو ہاتھ ننگی پیٹھ پر جڑ دیئے۔ اور بھاگنے کی کوشش کرنے والے منگلو کو ایک بار پھر کھینچ کر پٹڑی پر بٹھایا۔ تقریباً یہی معمول روز کا تھا۔ تھکی ہاری روپا فیکٹری سے تین بجے لوٹتی۔ کھانا کھا کر منگلو کو ساتھ لے کر لیٹتی...... مگر منگلو اس کو سوتا دیکھ کر باہر نکل پڑتے...... تھوڑی ہی دیر بعد چیخنے چلانے کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹتی اور منگلو کو بچا کر وہ واپس گھر لاتی۔

''مار پٹائی اچھی بات نہیں ہے کہیں زور سے لگ جاتی تو۔''

''وہ سب چڑھاتے ہیں کہتے ہیں۔''

''تو چڑھانے دو۔'' ماں نے بات کاٹی۔

''تم کو تو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے...... بننا ہے نا۔'' ماں بے حد لاڈ سے سر سہلاتے سہلاتے انہیں خوابوں کی حسین وادیوں میں چھوڑ آئی۔ جہاں منگل پانڈے عرف منگلو کو اس رات بے حد اچھی نیند آئی اور وہ ساری رات بڑا آدمی بننے کی جستجو میں لگے رہے۔ مگر دن بھر کی تھکی ہاری روپا کو ہر رات کی طرح آج بھی نیند کے لئے جدوجہد کرنی پڑی...... پتہ نہیں زندگی کی اتنی ڈھیروں مشکلات اس کے حصے میں ہی کیوں آئی ہیں۔ تیکھے نین نقش اور بھرے بھرے بدن والی روپا کو گاؤں کے چودھری کے لڑکے لکھن نے پہلی بار اچھل اچھل کر کیریاں توڑتے اپنے ہی باغ کے باہری حصے میں دیکھا تھا۔ اور کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ اس حسینہ نے کیریوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اپنے آنچل میں چھپا لیا ہو۔ سامنے آ کر اس نے ہاتھ بڑھایا چار کیریوں کا گچھا توڑ کر روپا کے سامنے نچایا...... روپا اس سے چھیننے کی کوشش میں لپکی...... ٹکرائی اور دوپٹے میں جمع باقی کیریاں چاروں طرف بکھر گئیں اتنی دیر کی محنت بیکار ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لکھن آنسوؤں کی دھار میں بہہ گئے۔ اور بہلاتے پھسلاتے معافی مانگتے کیریاں اٹھا اٹھا کر اس کے آنچل میں اس وعدے کے ساتھ بھرتے رہے کہ وہ ابھی اس سے زیادہ کیریاں پیڑ پر چڑھ کر اس

کے لئے توڑیں گے۔" "سچی" معصوم سی روپا اتنی خوش ہوگئی کہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ تین دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا پتہ نہیں کس نے یہ سب ہو بہو لکھن کے گھر جا کر اس طرح بیان کیا کہ چودھری نے اپنے سے بے حد نیچی ذات کی روپا کے باپو کو بلا بھیجا اور کیا کہا کہ انہوں نے دو دن بعد گاؤں کے نالائق اور آوارہ گوپی سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ لکھن نے آج بھی اس کے لئے کیریاں توڑنے کا وعدہ کیا تھا روز کی طرح روپا پانی بھرنے کے لئے نکلنے ہی والی تھی کہ ماں نے اسے روک کر گوپی سے اس کی شادی کی بات بتائی اور اسے گھر میں رہنے کے لئے کہہ کر خود پانی لینے چلی گئی۔ شادی وہ بھی گوپی سے...... اچانک...... جبکہ اس کا رشتہ تو پچھلے سال ہی دوسرے گاؤں میں طے ہوا تھا اور اب یہ نکما گوپی...... مجھے نہیں کرنی یہ شادی وادی...... الھڑ پن سے اس نے سوچا۔ لکھن کیریاں توڑ رہا ہوگا...... کہیں کوئی اور نا لے لے...... دروازہ باہر سے بند تھا۔ نیچی سی دیوار کود کر وہ باہر نکل گئی۔ تھوڑا آگے بڑھی تھی کہ کسی نے اسے آواز دی۔

"تم یہاں...... کیریاں کب توڑو گے...... مجھے جلدی......"

"چپ......" لکھن اس کا ہاتھ پکڑے چھپتے چھپاتے ٹیلے کے اس پار لے آیا۔

"سب کو پتہ چل گیا۔"

"کیا۔"

"یہی کی ہم کیریاں توڑ رہے تھے۔"

"پھر۔"

اس "پھر" کو سمجھانے میں لکھن کو کافی محنت کرنی پڑی۔ تب جا کر روپا کے پلے ساری بات پڑی۔ اس نے گوپی کے ساتھ شادی کی بات بھی بتائی۔ اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی۔ لکھن اس گہرائی میں ڈوبتا رہا۔ اور جب ابھرا تو دونوں رسم و رواج سے بہت دور اپنی دنیا بسانے میں جٹے تھے۔

"کچھ ہو گیا تو...... تم آؤ گے نا" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"میں آؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" بے حد مضبوط لہجہ تھا۔

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ ماں باپو چاچا چاچی کے ساتھ رات دیر تک حساب کتاب میں جٹے رہے۔ کل اس کی شادی ہے۔ محلے پڑوس کی عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فکر اس بات کی زیادہ تھی کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔ ٹوہ لینے کے لئے اس کے پاس بھی بیٹھتیں...... شادی طے ہوئی ہے تو سب اتنے سوال کر رہے ہیں کل جب......؟ آنگن میں کام میں جٹی ماں سے اس کی نظر ٹکرائی۔ کیا تھا ان نظروں میں کہ ماں فوراً اس کے پاس آئی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''ہم غریب ہیں۔ ہماری قسمت اوپر والا نہیں بلکہ یہ بڑے اور عزت دار لوگ لکھتے ہیں۔ میں تو تجھے سکھی رہنے کا آشیرواد بھی نہیں دے سکتی جانتی ہوں کہ......'' ایک بوجھ تھا دل پر جو اتر گیا۔ اس نے چھوٹا سا تھیلا باندھا اور اندھیرا ہوتے ہی گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی ہی دور پر اسے لکھن مل گیا اور دونوں ایک انجانی دنیا کی طرف اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلتے منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔

''ماں میں نے کل سپنے میں دیکھا میں خوب بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ یہ بڑا سا گھر اور......''

''بڑا آدمی سپنے میں نہیں بنتے...... اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ پڑھنا لکھنا پڑتا ہے اور......''

''اور پھر بڑا آدمی بنا جاتا ہے۔'' منگلو خوشی سے ناچتے ہوئے باہر نکل گئے۔ بہت سے کام تھے گھر کے جو وہ شام کو نپٹاتی، کپڑے دھونا، جھاڑو لگانا، سبزی لانا صبح سویرے منگلو کو اسکول چھوڑ کر اسے فیکٹری کے لئے نکلنا پڑتا۔ پیکنگ کا مشکل کام...... اوپر سے ساتھ کام کرنیوالوں کی گھٹیا باتیں...... اور اس سے بھی زیادہ گھٹیا نظریں...... وہ اپنے آپ میں کمٹی رہتی...... یا پھر سمٹنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کر تو وہ کچھ بھی نہیں پائی تھی جب لکھن کی بیوی بن کر گاؤں لوٹی تھی...... بھاگ کر شادی تو کر لی تھی۔ مگر پھر بھاگنے کے لئے یہ دنیا ہی ان کے لئے چھوٹی پڑ گئی۔ لکھن سب سے پہلے اسے ایک دوست کے گھر لے گیا۔'' کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا اور لکھن اپنے امیر باپ کے گھر لوٹ جائے

گا اس مدد کے عوض اس کے بھی وارے نیارے ہو جائیں گے۔'' دوست کا خیال تھا۔ مگر لکھن نے جب واپسی کا ارادہ ترک کر کے وہیں رہنے کا پلان بنایا تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ خود غائب ہو گیا۔

لکھن اسے لے کر اپنی ممیری بہن کے گھر آ گیا۔ شادی میں نا بلائے جانے پر پہلے تو اس نے پیار بھری شکایتیں کیں پھر نینگ کی لمبی لسٹ بھی سنا دی۔ مگر دو چار دنوں میں ہی اس نے حقیقت بھانپ لی اور انہیں باہر کا راستہ دکھا دیا۔

''گھر چل کر سب کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیں گے۔ بھلا ماں باپ کب تک ناراض رہ سکتے ہیں۔'' دونوں کا خیال تھا۔

دروازے پر لکھن کے بڑے بھائی کی پتنی انہیں دیکھ کر ایسے چیخی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ماں گھبرا کر باہر نکلی۔ ''ماں'' دونوں نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔ آشیرواد دینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ماں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ ایک ایک کر کے پورا گھر جمع ہو گیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بڑی بہو کو پہلی بار گھر کے بڑوں کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ وہ بھلا اسے کیسے جانے دیتی۔ ''گھر خاندان، برادری گاؤں ہر جگہ ناک کٹوانے کے بعد وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں.....'' اس سوال سے ہٹنے کو وہ تیار نہیں تھی۔ لکھن اور روپا کی جھکی نظریں اور کپکپاتے ہونٹوں کے اندر پھنسے الفاظ بھلا کون سنتا۔ روپا چکرا کر گر پڑی۔

''یہ سب ناٹک یہاں نہیں چلے گا۔ ابھی تک جہاں گلچھڑے اڑا رہے تھے۔ جا کر اڑاؤ۔'' بھاوج نے سب کی طرف سے فیصلہ سنا دیا۔ ڈیوڑھی خالی ہو گئی۔ رسوئی سے ماسی نے پانی لا کر روپا کے چہرے پر ڈالا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے اس کے گھر پہنچا دو۔''

''کیا ہوا میری بچی کو۔'' روپا کو دیکھتے ہی اس کی ماں چلائی۔

''ہم بہت نیچے اور غریب لوگ ہیں تمہارے گھر والے اچھی طرح جانتے ہیں تم کیسے بھول گئے۔''

''بابا روپا میری ہے اور......''

''بس اپنے گھر جاؤ۔ بہت سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا...... پھر آنا۔'' روپا کے بابا نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

''کون بڑا ہے اور کون چھوٹا یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے بابا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔''

پتہ نہیں لکھن نے کون سی کوشش کی اور کیا فیصلہ کیا مگر روپا کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ دوسرے دن کھیت میں لکھن کی لاش بے حد بری حالت میں پائی گئی۔ اس کے گھر والوں کے مطابق اس کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوئی۔ آناً فاناً اس کا انتم سنسکار کر دیا گیا۔ روپا کے لئے سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی اور نیم پاگل سی نظر آتی۔ گھر والوں کے لئے اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا...... مگر ننھے منگلو کو گود میں لے کر وہ خود بہ خود سنبھلنا سیکھ گئی۔ مگر اس کے مقدر میں تو پھسلن ہی پھسلن تھی۔ چھوٹا سا منگلو جب گھر کے باہر کھیلنے جانے لگا تو لوگوں کی عجیب نظریں روپا کا جینا مشکل کر دیتیں۔

''تو یہ ہے روپا کا چھورا...... کیوں...... کون ہے تیرا باپ'' ایک دن یہی سوال منگلو نے روپا کے سامنے رکھ دیا۔

''تیرا باپ چودھری رام لکھ......''

''نا بیٹی...... نا...... کہیں ایسا نا ہو کسی دن کوئی سانپ تیرے منگلو کو بھی ڈس لے اور توں......''

جو سوال اس کے دماغ میں پچھلے چار برس سے کلبلا رہا تھا اس کا جواب اسے باپو سے مل گیا۔ وہ منگلو کو یہاں سے بہت دور لے جائے گی۔ سانپ کی پہنچ سے دور...... بے حد دور...... اس نے اپنے دل میں عہد کیا، اور منگلو کو لے کر راتوں رات اپنی رشتے کی موسی کے گھر بمبئی آ گئی۔ جلد ہی ایک فیکٹری میں اسے پیکنگ کا کام مل گیا اور وہ موسی کے گھر کے ایک کمرے میں بطور کرائے دار رہنے لگی۔ مگر یہاں بھی اس کی قسمت آڑے آ گئی۔ منگلو وہاں کے بچوں کی زبان سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس لئے سب اسے چڑاتے...... چھیڑتے اور توں کہاں سے آیا رے...... توں کہاں کو جائے گا۔'' کورس میں گاتے ہوئے اسے للکارتے

......تو کنکر پتھر جو بھی ہاتھ میں آتا وہ ان پر پھینکتا...... کسی کو لگ جاتی تو قیامت آجاتی...... سب مل کر اسے دھن دیتے۔ کبھی ماتھے سے خون تو کبھی ہاتھوں پیروں سے...... منگلو کو وہ پیار سے سمجھاتی...... تو کبھی غصے میں آ کر اس کے گال لال کر دیتی...... تو کبھی خود ہی بلک بلک کر رو پڑتی۔ منگلو اس کو روتا دیکھ کر تڑپ جاتا...... معافی مانگتا...... ان بچوں کے پاس نا جانے کا وعدہ کرتا...... مگر سب بے فضول...... دو چار دن کے بعد پھر وہی قصہ دہرایا جاتا۔ اب کیا کرے...... ایک ہاتھ میں سبزی کا تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی لئے وہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ منگلو ٹوٹے پھوٹے ڈبوں سے بڑا سا گھر بنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بیچ راستے میں سب چھوڑ کر ٹی وی دیکھنے اندر چلے گئے۔ روپا کا پیر ان ڈبوں میں الجھا اور وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ دو مضبوط بانہوں نے سہارا دے کر اسے سنبھال لیا...... بالٹی لڑھک گئی...... تھیلا زمین پر اور وہ...... عجیب حالت تھی فوراً سنبھلنے میں بھی کافی دیر ہوگئی۔

"ارے روپا یہ میرا بھائی رمیش ہے۔ کام سے آیا ہے۔ دو دن بعد چلا جائے گا۔" وہ بکھرے آلو تھیلے میں بھرنے لگی۔ رمیش موسی کے پاس چلا گیا۔ وہ اندر آئی۔ اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ موسی نے اس کے بارے میں بھی شاید رمیش کو بتایا ہوگا اور اب وہ بے حد دلچسپی سے منگلو کے ساتھ گھر بنا رہا تھا۔

"ایک کمرہ اپنے لئے بھی بناؤ نا انکل۔" ڈبہ اٹھائے منگلو بے حد معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ چکلے پر روٹی بیلتے ہوئے اس کے ہاتھوں کا دباؤ اتنا بڑھا کہ روٹی پھٹ گئی۔

رمیش دو دنوں کیلئے آیا تھا۔ مگر آج اسے ساتواں دن تھا۔ وہ کام پر جانے کے لئے نکلتی تو وہ باہر کھڑا ہوتا۔ واپس ہوتی تو اس کے پیچھے پیچھے ہی گھر میں گھستا...... یہ اتفاق تو نہیں ہو سکتا...... ایک گھر میں رہنے کے باوجود دونوں میں ضرورت کے تحت رسمی سی بات ہوتی۔ لکھن کے جانے کے بعد منگلو ہی اس کا سہارا تھا۔ اور کسی کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر اب...... اس کا من پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتا۔ موسی نے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ رمیش نے من کی بات شاید خود کہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد موسی نے سلجھے ہوئے انداز میں بے حد مشکل جذبات کو لفظوں میں پرو کر دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا۔

''روپا جی...... میں کوئی لمبے چوڑے وعدے نہیں کروں گا۔ زندگی کی جدوجہد میں کوئی ساتھ ہو تو مشکل گھڑی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ شاید آپ بھی ایسا ہی سوچتی ہوں...... رہی بات منگلو کی تو جتنی ذمہ داری آپ کی ہے اتنی ہی میری بھی ہوگی۔ ہم مل کر......''

روپا پر وہ الفاظ تپتے ریگستان میں ننگے پاؤں چلنے سے پڑنے والے چھالوں پر ٹھنڈی بوچھار بن کر گرے۔ اور وہ اس سے شرابور ہو کر باہر نکلی۔ رمیش کا چھوٹا سا گھر اس کے خوابوں میں بسی دنیا کی طرح تھا۔ جہاں وہ اپنی مرضی کے رنگ بھرتی رہی۔ ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا زندگی میں...... وقت گزرتا رہا...... اسکول یونیفارم چھوڑ کر منگلو کالج میں آ گیا اور آج وہ اسے اونچی تعلیم کے لئے ایرپورٹ پر آسٹریلیہ جانے کے لئے وداع کر رہی تھی۔

''اپنا خیال رکھنا۔ رات کو دودھ ضرور پی کر سونا۔'' یہ ماں تھی۔

''دو سال یوں گزر جائیں گے۔'' اس نے چٹکی بجائی اور اندر چیکنگ کے لئے چلا گیا۔ سب سونا سونا ہو گیا۔ روپا سے زیادہ رمیش کو اس کی کمی کھلتی۔

''ہمارا بیٹا کچھ دبلا ہو گیا ہے۔'' انٹرنیٹ پر منگلو کی تصویریں دیکھ کر رمیش نے کہا تھا اور اسے وقت پر کھانے پینے کی ڈھیروں نصیحت کی۔

''مگر پاپا میں پہلے سے موٹا ہو گیا ہوں۔ سب دوست یہی کہتے ہیں۔''

''بس بس رہنے دے۔ یہ بتا واپسی کا ٹکٹ کروا لیا۔'' روپا بیچ میں آ گئی۔

آج اس کا آخری پیپر تھا اور پھر دوستوں کے ساتھ مل کر پارٹی منانی تھی دوسرے دن اس کی فلائٹ ہے۔ باقی باتیں گھر میں بیٹھ کر ہوں گی۔ اپنے E-mail میں اس نے لکھا تھا۔

''ٹائم تو بتایا ہی نہیں...... فلائٹ یہاں کب پہنچے گی۔'' روپا پریشان تھی۔ تبھی فون بجا۔

''کیا'' وہ چیخی۔ اور موبائل ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رمیش نے فون اٹھایا۔ ''پارٹی سے نکلنے کے بعد کچھ لوگوں سے اس کی کہا سنی ہو گئی اور مار پیٹ بھی۔ جس سے اس کی......''

''اتنی دور پرائے دیش میں کہاں سے کون سا سانپ آ کر اسے ڈس گیا۔'' ویران اور سوکھی آنکھوں سے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے وہ رمیش سے پوچھ رہی تھی۔

☆☆☆
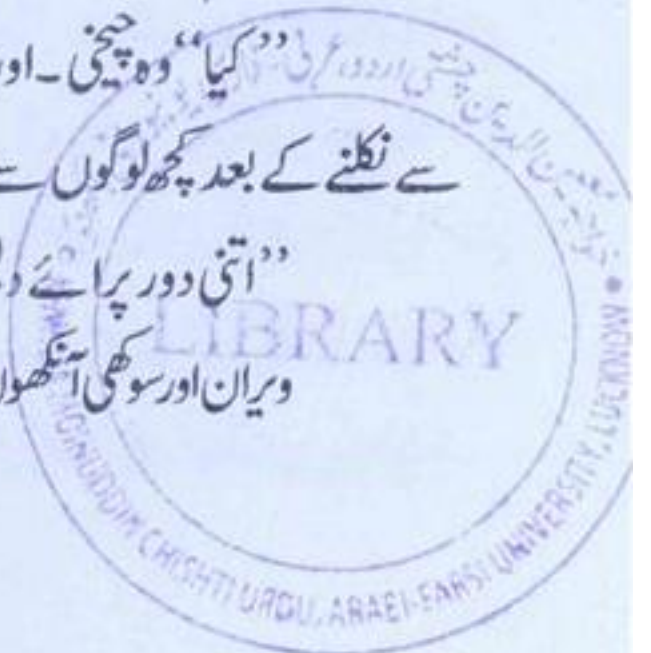
CHAND MERA HAI

(A Collection of Short Stories)

by

Ghazala Qamar Ejaz

Name	: Dr. GHAZALA QAMAR EJAZ
Education	: M.Sc. , M.A. , Ph.D. (Aligarh)
Address	: Flat No. 132-B MIG Flats, Rajouri Garden, New Delhi- 110027 (INDIA)
E-mail	: qamar_ghazala@yahoo.com
Under Publication	: 1. 1960 ke Baad Khawateen Afsana Nigar 2. Gharaunda (A Collection of Short Stories)
Award	: Katha Award
Short Stories Translated in	: Punjabi,Telgu & Oriya Languages

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-813-8